جلد ۱۴۵ ماہ ذی قعدہ سنہ ۱۴۱۰ھ مطابق ماہ جون سنہ ۱۹۹۰ء عدد ۶

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

مذہبی و دینی تعلیم سے مسلمانوں کی بے پروائی اور موجودہ حالات میں اس کے نصاب و نظام کے بے فیض اور غیر اطمینان بخش ہونے کا ذکر ان صفحات میں کئی بار ہوچکا ہے، جدید عصری تعلیم سے مسلمانوں کی غفلت اور عدم دلچسپی بھی کم افسوسناک نہیں ہے، جب سرکاری و نیم سرکاری اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ان کی تعداد بہت کم ہوگئی ہے تو سرکاری ملازمتوں میں ان کا تناسب کیسے زیادہ اور اطمینان بخش ہوسکتا ہے؟ دراصل تعلیمی پسماندگی مسلمانوں کی قومی و ملی زندگی کے لیے نہایت ضرر رساں اور تباہ کن ہے، اس کی وجہ سے وہ اپنے سماج اور اپنے ملک میں بالکل بے وزن اور کم حیثیت ہوگئے ہیں، وہ نہ ترقی کے موجودہ مواقع سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور نہ ملک کی تعمیر و تشکیل کی مشترکہ جدوجہد میں ان کا کوئی قابل ذکر حصہ ہوسکتا ہے، ملک کی پسماندہ قوموں اور پیچھے رہ جانے والے طبقوں نے اپنی تعلیمی پسماندگی دور کرکے ملک اور سماج میں اپنی بہتر اور مستحکم جگہ بنالی ہے، مگر مسلمانوں کا وقار اور اعتبار برابر گھٹتا ہی جارہا ہے ؂

یاران تیز گام نے محمل کو جالیا   اور ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے

انگریزوں کے دور میں مسلمان جدید تعلیم کے معاملہ میں حیص بیص میں پڑے ہوئے تھے، اور اب قومی حکومت کے زمانے میں بھی وہ لیت و لعل اور توقف و تذبذب کی پالیسی پر گامزن ہیں، اور ملک کے نئے حالات اور نئے تقاضوں سے اپنے کو ہم آہنگ نہ کرکے مسلسل نقصان اور خسارہ اٹھا رہے ہیں، وہ یہ بھول گئے ہیں کہ علم و حکمت ان کی متاع گم شدہ ہے، یہ جہاں اور جس سے بھی ملے انھیں حاصل کرنے میں نہ سستی اور کاہلی کو راہ دینا چاہیے اور نہ خوف و جھجک محسوس کرنا چاہیے، علوم و فنون کو شجرۂ ممنوعہ سمجھ کر ان سے کنارہ کش اور بیزار رہنا مسلمانوں کا شیوہ نہیں، دوسروں کے علوم میں مکمل دستگاہ و مہارت پیدا کرکے ان سے گوئے سبقت لے جانا اور غیر اسلامی

علوم و فنون پر بھی اپنی گہری چھاپ ڈال کر انھیں اسلامی علوم و فنون میں تبدیل کرلینا مسلمانوں کا طرۂ امتیاز رہ چکا ہے، ہندوستان سے مخصوص سمجھے جانے والے علوم ہندسہ، ریاضی، نجوم اور طب وادویہ وغیرہ پر عباسیوں کے دور ہی میں اسلامی چھاپ پڑچکی تھی اور ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے زمانے میں سنسکرت، برج بھاشا اور ملک کی دوسری زبانوں میں مسلمانوں نے کمال بھی پیدا کیا اور ان زبانوں میں اپنے گوناگوں علمی نقوش بھی یادگار چھوڑے۔

سرسید احمد خاں مرحوم کا یہ بڑا احسان ہے کہ جب اپنے سماج اور اپنے ملک میں مسلمان جدید تعلیم سے بیزار ہوکر اپنی اہمیت اور وزن کھوتے جارہے تھے تو انھوں نے مدرسۃ العلوم کی داغ بیل ڈالی جس نے ان کی بے مائگی اور تعلیمی افلاس و پسماندگی کو دور کرکے ان کی ساکھ کو گرنے سے بچالیا، اور ہمسایہ قوموں اور ہم چشموں میں ان کا وقار و اعتبار باقی رکھا، یہی مدرسہ ترقی کرکے اب عظیم الشان یونیورسٹی میں تبدیل ہوگیا ہے جو ہندوستان کے مسلمانوں کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ہے، اگر یہ یونیورسٹی نہ ہوتی تو اس ملک میں مسلمانوں کا جو حال ہوتا اس کا تصور کرنا بھی مشکل ہے، اس کا تحفظ مسلمانوں کا قومی و ملی فریضہ ہے۔

مسلمانوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسی یونیورسٹیاں قائم کرنے پر اپنی توجہ مبذول نہیں کی، جنوبی اور مغربی ہند میں ان کے اسکولوں اور کالجوں کی حالت بہتر ہے مگر وہاں بھی ان کی کوئی یونیورسٹی نہیں ہے، شمالی اور مشرقی ہندوستان میں ان کے اسکولوں اور کالجوں کی تعداد ہی کتنی ہے، اور جو ہیں ان کا تعلیمی معیار برابر گر رہا ہے، وہ ایک بحرانی کیفیت میں مبتلا ہیں جو خود اپنے منتظمین ہی کے ہاتھوں حالت نزع میں جا پہونچے ہیں، مسلمانوں اور ان کے قائدین کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ وقتی اور ہنگامی تحریکوں اور جذباتی نعروں سے نہ مسلمانوں کی روح مضمحل میں جان آسکتی ہے اور نہ اس ملک میں ان کا وزن و وقار قائم رہ سکتا ہے بلکہ انھیں اپنی تعلیمی کم مائگی اور معاشی پسماندگی دور کرکے اپنے اندر سیاسی شعور اور بیداری

پیدا کرنی چاہیے جس کے لیے جدید تعلیم کے قدیم مراکز میں نئی روح پھونکنا اور اپنے زیر انتظام عصری علوم کی نئی درسگاہیں قائم کرنا ہوگا، یہ ایک ہی شہر اور قصبہ میں نئے نئے بے مقصد عربی مدرسے قائم کرنے سے زیادہ ضروری ہے جن کی کثرت سے امت کے اختلاف کی خلیج مزید وسیع ہو رہی ہے۔

۱۹۸۸ء و ۱۹۸۹ء میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے صد سالہ جشن ولادت کی مناسبت سے متعدد رسالوں کے خاص نمبر شایع ہوئے لیکن کیفیت و کمیت کے اعتبار سے حکومت ہند کے سہ ماہی عربی مجلہ ثقافۃ الہند سے بہتر نمبر ہماری نظر سے نہیں گذرا، ۱۹۸۸ء کی اس کی مکمل اشاعت مولانا پر خاص نمبر کے لیے وقف رہی جو دو حصوں پر مشتمل اور تقریباً ۷۵۰ صفحہ کا ہے، مضامین کی مجموعی تعداد ۵۰ ہوگی، پہلا حصہ مولانا کے حالات و سوانح، اپنے معاصرین سے تعلقات، ان کی علمی، سیاسی اور انقلابی سرگرمیوں اور ان کی عبقریت و انفرادیت پر ممتاز اہل قلم کی نگارشات کا مجموعہ ہے اور دوسرے حصہ میں مولانا کے افکار و نظریات اور تصنیفات ترجمان القرآن اور غبار خاطر پر مضامین درج ہیں، اس میں مولانا کی بعض تحریروں، خطبوں اور غبار خاطر کے بعض خطوط کے عربی ترجمے اور پہلے حصہ میں انڈین کانگریس کے سالانہ جلسہ منعقدہ دہلی دسمبر ۱۹۲۳ء کے خطبۂ صدارت کا عربی ترجمہ شائع کیا گیا ہے۔

مجلہ ثقافۃ الہند کے آزاد نمبر کے دونوں حصے اردو و عربی کے مشہور اہل قلم جناب نثار احمد فاروقی صدر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کی محنت شاقہ اور مساعی جمیلہ کا ثمرہ اور مولانا کی ذات و شخصیت سے ان کی عقیدت و شیفتگی کا نتیجہ ہیں جن کے لیے اہل علم اور مولانا کے قدر دانوں کو ان کا ممنون ہونا چاہیے، دونوں حصوں کے شروع میں ان کے پُر مغز اور موثر افتتاحیوں سے بھی اس نمبر کی قدر و قیمت بڑھ گئی ہے، یہ مجلہ کئی برس سے فاروقی صاحب کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے انھوں نے اس کا معیار بلند و بہتر بنانے کے لیے جو ریاضت و جانفشانی کی ہے اس کا ثبوت یہ خاص نمبر بھی ہے اس کی یہ خصوصیت بھی قابل ذکر ہے کہ دلچسپی رکھنے والے افراد اور اداروں کو یہ مجلہ مفت پیش کیا جاتا ہے پتہ یہ ہے: انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز۔ آزاد بھون۔ آئی۔ پی اسٹیٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

مقالات

کیا دیوان قطب الدین، دیوان خواجہ بختیار کاکی ہے؟

از

پروفیسر نذیر احمد، علی گڑھ

دیوان قطب الدین نول کشور پریس میں چند بار دیوان قطب الدین بختیار کاکی کے نام[1] سے چھپا، اور اس کے کچھ قلمی نسخے بھی اسی نام سے ملتے ہیں، مثلاً ایک نسخے کا ذکر فہرست مشترک پاکستان جلد ہفتم ص ۲۰۲-۲۰۳ پر موجود ہے، اس نسخے کا آغاز وہی ہے جو مطبوعہ نسخے کا ہے، دیوان مذکور کا طبع دوم رمضان ۱۲۹۵ھ / اگست ۱۸۸۲ء میرے پیش نظر ہے، یہ نسخہ میرے ایک دوست ولی الدین صاحب مقبرہ دوم، مراد آباد کا عطیہ ہے، انھوں نے ایک موقع پر جب میں اپنے ایک عزیز سے ملنے مراد آباد گیا تھا، ۱۴ مارچ ۱۹۸۸ء کو عنایت کیا تھا، اسی درمیان یہ دیوان میرے مطالعہ میں رہا، اور اس وقت جو کچھ سپرد قلم کیا جا رہا ہے وہ اسی مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

دیوان قطب الدین کا یہ نسخہ ۲۲۶ صفحات پر مشتمل ہے، جس کے اجزا حسب ذیل ہیں

غزلیات بہ ترتیب حروف تہجی ص ۲-۲۰۹

پہلی غزل اے لال در ثنائے صفات زبان ما ٭ وے در صفات وحدت تو عقل نارسا

---

[1] مشارہ ۲: ۲۲،۲ میں چار بار طبع ہونے کا ذکر کیا ہے (فہرست مشترک ۷: ۲۰۲)

آخری: اے بر سر کوئے تو بہر گوشہ شہیدی — وے داغِ تو بر سینۂ ہر پیر و مریدی

رباعیات : ۲۰۹ - ۲۳۳ (۲۵ رباعیاں)

ابتدا : اے بادشہ پادشہ پادشہاں — وے واقف جرم آشکار و نہاں

خاتمہ : گر شیر خدا نہ رہنمایت باشد — ختمت بخدا کہ ہم خدایت گرد

آخر میں خاتمۃ الطبع کے ذیل میں تین صفحے میں حضرت قطب الدین بختیار اوشی کے مختصر حالات اور طباعت کا ذکر ہے۔

خواجہ بختیار خواجہ معین الدین چشتی کے اجل خلفاء میں تھے، وہ ماوراء النہر کے قصبہ اوش[1] میں پیدا ہوئے، پانچ سال کی عمر میں وہ شیخ ابو حفص کی خدمت میں گئے، وہاں انھوں نے ان کو بختیار کے لقب سے خطاب کیا جو حضرت خضر علیہ السلام کی ہدایت کا اثر تھا، کاکی کی نسبت کاک کی طرف ہے، جو ایک قسم کی ہلکی پھلکی روٹی یا کلیچہ[2] ہے، کہتے ہیں ایک مرتبہ خواجہ نے اپنی زوجۂ محترمہ سے فرمایا کہ بسم اللہ کہہ کر طاق کی طرف ہاتھ بڑھاؤ، اور جتنی کاک کی ضرورت ہو وہاں سے لے لو، اس وقت سے ان کا لقب کاکی قرار پایا، تاریخ ولادت ۵۸۲ اور تاریخ وفات ۶۳۴ھ ہے، کہتے ہیں قوالوں کے اس شعر کے پڑھنے پر ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی[3]:

کشتگان خنجر تسلیم را — ہر زماں از غیب جانِ دیگر است[4]

---

[1] اوش اندجان فرغانہ کا ایک قصبہ ہے، یہ شہر دریائے فرغانہ کے کنارے شہر فرغانہ کے شمال مشرق میں واقع ہے، بابر کا تعلق بھی اسی خطہ سے تھا۔ [2] ہندوستان میں کلچہ ہے [3] فوائد الفواد میں یہ واقعہ نقل ہے۔

[4] یہ شعر شیخ احمد جام کا ہے جو عارف ہونے کے باوجود شاعر اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں، میر حسن نے اسی زمین میں ایک غزل لکھی جس میں اس شعر کی اس طرح تضمین کی ہے ؎ (ص ۴۰۷ پر)

اس کے بعد ولادت اور وفات کے دو قطعے ہیں: قطب عاشق (۵۸۲) اور عاشق سالک (۵۸۲ھ) دونوں سے تاریخ ولادت نکلتی ہے، اور وفات کی تاریخ (۶۳۴ھ) جنت مقام اور عالم الاسرار دونوں سے نکلتی ہے۔

آخر میں ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر اس طرح ملتا ہے، بڑی تلاش کے بعد دیوان متبرک کا ایک نسخہ دستیاب ہوا، تو منشی نول کشور نے بڑی توجہ سے ایک خوش نویس کاتب کو کتابت کے لیے دیا، نسخے میں پہلی غزل کا شعر اس صورت میں تھا:

اے لال در ثنائے صفاتت زبان ما — اے در صفات وحدت تو لال عقل ما

کاتب بڑا سمجھدار تھا، اس کو دوسرے مصرعے کا قافیہ کھٹکا تو اس نے اس کو نہ لکھا اور جگہ چھوڑ دی، پھر وہ جناب استاذ الشعراء آفتاب الدولہ بہادر قلق کی خدمت میں حاضر ہوکر سارا ماجرا ان کو سنایا، انھوں نے فرمایا کہ یہ اہل ظاہر کا کلام نہیں ہے کہ اس میں دخل دیا جائے یہ کلام اہل اللہ اور عالی الشان صاحب باطن کا کلام ہے، ہمیں تصرف جائز نہیں، وہ منجر صاحب (منشی شیو پرشاد صاحب مطبع اودھ اخبار) کو ساتھ لے کر اپنے پیر و مرشد جناب مولانا محمد عبد الرزاق صاحب کی خدمت میں پہنچے اور بڑے خشوع و خضوع سے دیوان کے اس مشتبہ مقام کو دکھایا، مولانا نے فرمایا توقف کیجئے، اور خود حجرے میں تشریف لے گئے، تھوڑی دیر بعد نکلے تو فرمایا: دوسرا مصرع اس طرح فرمایا ع

وے در صفات وحدت تو عقل نارسا

اور پھر دوسرا مصرعہ اسی طرح نقل ہوا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) حال بریں یک بیت داد دست آں بزرگ — آری ایں گوہر زکانِ دیگر ست

کشتگانِ خنجر تسلیم را — ہر زماں از غیب جانِ دیگر ست

اس تفصیل سے اندازہ ہوگا کہ دیوان قطب کو کتنے احترام سے چھاپا گیا تھا، اور یہ سب اس وجہ سے ہوا کہ یہ ایک عارف باللہ کا کلام ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس دیوان کو حضرت خواجہ بختیار کاکی سے کسی قسم کا تعلق نہیں، یہ نہ خواجہ کا ہے اور نہ ان کے زمانے کے کسی دوسرے شاعر کا، بلکہ ان کے عہد کے چار پانچ سو سال بعد کا ہے، سرسری طور پر اس کے مطالعے سے اسی نتیجہ پر پہونچا ہوں اور یہ نتیجہ قطعی ہے، یعنی یہ دیوان خواجہ بختیار کا نہیں ہے اس میں کوئی شبہہ نہیں، کوئی ان کا ہمنام (یعنی قطب الدین) تھا، اس کا یہ کلام ہے، البتہ اب تک میں اس مجہول ہمنام کی شخصیت کے تعین سے قاصر ہوں۔

ان ابتدائی امور کے بعد مسئلہ کی حقیقت کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے۔

شاعر کا نام قطب الدین اور یہی اس کا تخلص تھا، جو اکثر قطب دین کی صورت میں بھی نظم ہوا ہے، دیوان کی ہر غزل میں یہ تخلص موجود ہے، عام طور پر تخلص نام سے مختصر ہوتا ہے اصولاً اس کا تخلص قطب ہونا چاہیے، لیکن یہ شاعر تخلص ایک جگہ بھی قطب نہیں لایا ہے یہ شاعر کافی بعد کے دور کا ہے، اس کو دسویں صدی کا بھی قرار نہیں دیا جاسکتا ہے گیارہویں صدی ہجری یا شاید اس کے بعد کا ہو، اس شبہہ کی بنیاد یہ ہے کہ اس کے کلام میں الفاظ، ترکیبات اور تشبیہات وغیرہ ایسے ہیں جو چھٹی ساتویں صدی میں بالکل ناپید تھیں، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

او مظہر جمال بود، شمع ہمہ خیال بود اعداش بے ایماں بود، مستم غلامش بے ریا (ص ۲)

"بی ایماں" کا اس طرح کا استعمال آج سے سات سو برس پہلے فارسی میں ناممکن تھا

بنگر چہ نیکو مظہر ست با ما بشیر لی شر ست اسم شریفش حیدر است وز حق نباشد او جدا (ص ۲)

"اسم شریف" کا استعمال فارسی میں بے سابقہ معلوم ہوتا ہے۔

قابل شہید در غم عشق می شود ناقابلست آں کہ طلب می کند دوا (ص ۷)

قابل اور ناقابل کا استعمال اس طرح کلاسیکی فارسی میں نہیں ملتا، اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ یہ دونوں لفظ اس دیوان میں بار بار آئے ہیں۔

از ما بغیر درد تو چیزے طمع مدار اینست پیشگی بخدا زاد راہ ما (ص ۱۱)

"پیشگی" کا استعمال نیا ہے، قدیم فارسی سے اس کا کیا سروکار۔

از ناخدا امید بہ کلی بریدہ ام شاید کہ از میاں بکنار آورد مرا (ص ۱۵)

"بکلی" کا استعمال اور بھی ہے:

از ہر دو کون دست بہ کلی کشیدہ ام تا دست از وجود بکلی بشستہ اند (ص ۷۰)

واضح ہے کہ بکلی کا اس طرح استعمال اس دیوان کے جدید ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

ع فانی شو از وجود خود و محض دوست باشد

"محض دوست" کی ترکیب جدید ہے۔

قطب الدین کا انداز بیان جدید نظر آتا ہے، ذیل میں ایک غزل بطور نمونہ نقل کی جاتی ہے، اس کا مقابلہ اگر ساتویں آٹھویں یا نویں صدی کے کلام سے کیا جائے تو اندازہ ہوجائے گا کہ یہ شاعر اتنا پرانا نہیں ہے:

لا منتہاست عالم بے اختیار ما پایان رہ بدید ندارد نگاہ ما

با خویشتن کسے نبرد رہ بکوئے یار بے خویشی است در رہ او اعتبار ما

دردیست در دلم کہ علاجش پدید نیست درمانِ او مگر کہ کند غمگسار ما

راہے کہ می روم نبرد عقل بے بدان دیوانگی است در رہِ دلدار کار ما

بوئے دفائے یلد وہد بعد عمرہا خارے کہ سر زند بخدا از فراد ما

ہرکس ز دردِ خویش علاجش طلب کند — درد آمدست مرہم جانِ نگارِ ما

راہے بجانبے نہ بود قطب دیں دگر — جز آستان یار کہ باشد حصار ما

ذیل میں بعض کچھ ایسے الفاظ اور ترکیبات کی نشاندہی کی جاتی ہے جو دیوان قطب الدین میں بتکرار ملتے ہیں، اور یہ الفاظ و ترکیبات اتنے قدیم نظر نہیں آتے:

قابل، ناقابل[1]

قابلے نیست کہ عشق تو ندارد در دل — ہر کہ عشق تو ندارد بخدا قابل نیست (۳۶)

فانی زخویش گشتہ و باقیست با خدا — آں قابلے کہ بار امانت کشیدہ است (۴۴)

در نماز عشق ہر جا دیدہ ام من قابلے — روئے دل او را بجز در طاق ابروئے تو نیست (۵۰)

قابل کسے بود کہ بملک وجود خویش — عاشق کسے ست کو بہ جہاں پشت پا زند (۸۲)

ہوسِ او نہ نہی از سر خود قطب الدین — زانکہ در سر ہوس مردم قابل دارند (۱۰۰)

در رہِ فقر و فنا ایک دل زخود وارستہ کو
رشتۂ دل قابلے در مہر جاناں بستہ کو
ہر کرا می بینم از وسواس دل در بند یاس
قابلے در راہ حق از خویشتن وارستہ کو (۱۸۸)

در ملک دل سفر کن اگر مرد قابلی — راہ حجاز از سر پیسی چہ رادوی (۲۰۴)

زخواب نیم شب ار مرد قابلی برخیز — زبہر دیدن دیدار یار دیدہ گشای (۲۰۴)

قابل شہید در رہ غم عشق می شود — ناقابل است آں کہ طلب می کند دوا

بخدا[2] جو اردو میں بکثرت مستعمل ہے، اس دیوان میں بھی بالتکرار ملتا ہے۔

۱؎ یہ لفظ دیوان حافظ میں نہیں آیا۔ ۲؎ دیوان حافظ میں یہ قسم ایک بار بھی نہیں

ع فانی اگر شوی بخدا باشدت بقا (ص ۸)

ہر کہ عشق تو ندارد بخدا قابل نیست (۳۶)

خارے کہ سر زنند بخدا از مزار ما — اینست پیشگی بخدا از او راہ ما (ص ۱۱)

دلیل عشق بود در رہ خدا بخدا (ص ۳۷)

قطع نظر[3]

قطع نظر ز ذوق ہمہ چیز کردہ است (ص ۳۷)

غیر از غم تو از ہمہ قطع نظر کنند (۶۹)

قطع نظر اس کے کہ ان سے زبان کی عدم قدامت کا ثبوت بہم پہنچے، متعدد ترکیبات ایسی ملتی ہیں کہ ان کا تکرار تقریباً ساڑھے تین سو اشعار کے دیوان میں بہت کھٹکتا ہے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

مرد رہی[4]

اگر مرد رہی از روئے قدرت تیغ لا برکش (۹)

قطب دیں در رہ غم عشق کش ار مرد رہی (۱۵)

قطب دیں فانی مطلق شو اگر مرد رہی (۲۲)

بر سر کوئے قناعت کن اگر مرد رہی (۴۳)

اگر تو مرد رہی پند او بجان بنیوش (۱۲۷)

گنج خود بشناس اگر مرد رہی پنہان خویش (۱۲۹)

ہمتی در رز دریں کوی اگر مرد رہی (۱۷۳)

۳؎ یہ فقرہ دیوان حافظ میں نہیں ہے۔ ۴؎ یہ لفظ حافظ کے یہاں صرف ایک بار ملتا ہے۔

وارستن[1]، وارستہ

تا زخود وانہ رہی نیست ترا ہیچ علاج (ص ۶)

طالب دنیا ندارد یک زمان وارستگی   گشت وارستہ کسے کو زد جہاں را پشت پا (ص ۱۶)

بر ہر کہ فگند سایۂ خویش   از نیک و بد زمانہ وارست (۲۹)

اہل درد کباید از دنیائے دوں وارستۂ (۲۹)

وارستگی علی الدوام است (۴۱)

آں ساعتے کہ وارہد انساں زخویشتن (۴۹)

ہر کہ می خواہد کہ از سودائے عالم وارہد (۵۰)

ورنگر در مفلس آں کوے کز وارستگی (۷۹)

وارستہ شوید از خود و از ملک دو عالم (۹۵)

در رہ فقر دنیا یک دل زخود وارستہ کو (۱۸۸)

علی الدّوام[2]

ذات جنابِ تست کہ باشد علی الدوام (۲۱)

کو را علی الدوام رضا در رضائے تست (۳۷)

ذوق تو علی الدوام دارد (۱۰۴)

باشد علی الدوام بوصلِ تو سرفراز (۱۱۹)

---

[1] یہ مصدر حافظ کے یہاں نہیں ملتا۔

[2] یہ فقرہ حافظ کے یہاں نہیں ہے۔

عمر ضائع[1]

افسوس زانکہ عمر بدیں ضائعی گذشت (۱۹)

عمر خود ضائع مکن فرصت غنیمت می شمار (〃)

عمر خود ضائع مکن داری قطب دیں خود را شناس (۲۰)

قطب دیں ضائع نہ کرد عمر عزیزی کہ داشت (۱۶۹)

بعض اشعار میں زبان و بیان کی کچھ خامیاں نظر آتی ہیں :

مقصود از دو کون بقای خدا بود   فانی اگر شوی بخدا باشدت بقا (۸)

"بقائے خدا" کا کوئی مفہوم نہیں۔

پس بکن کسب کمال امروز تخم نیک کار (۱۶)

تخم نیک کے بجائے تخم نیکی ہونا چاہیے۔

چو سایہ محو شدم از ظہور نور رخش (۷)

نور سے تاریکی دور ہوتی ہے نہ سایہ۔

چرا کز شعلۂ شمشیر سر عشق انگارم

شعلہ سے انگار نہیں ہوتا، خاکستر ہوتا ہے، شمشیر سے اَفگار کا تعلق ہے۔

"را" کے استعمال میں بے سلیقگی برتی گئی ہے۔

خون دل می خورد از کس مطلب درماں را

"را" کا حذف اولیٰ تھا۔

.. بر دار پردہ را ز کمال جمال خویش (۳)

---

[1] اگرچہ عمر ضائع شدن درست ہے لیکن اس کی تکرار یقیناً معیوب ہے، حافظ کے یہاں ضائع دوبار آیا ہے اور دونوں میں عمر کے ساتھ نہیں، البتہ ہندوستان میں بہت عام ہے۔

پردہ بردار بہتر تھا۔ "را" کا حذف انسب ہوگا۔

ما عاشقیم کشتہ شدن نیست عار ما　(۳)

عار برائے ما بہتر ہوگا۔

آں یار برگزیدہ شاید کند دوا را　(۹)

"را" کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

از بہر وصل آں ماہ پیوستہ گو دعا را　(۹)

"را" یہاں بھی زائد ہے

اعدائے اورا روسیہ اعمال شان جملہ تبہ　(۴)

اس میں اورا کے بجائے او ہونا چاہیے، ممکن ہے را کے بجائے کوئی دوسرا لفظ غلط چھپ گیا ہو، اگر یہ چھاپے کی غلطی نہیں ہے تو شاعر کی خود کی غلطی ہے۔

بظاہر اگرچہ بسی بی سرست وساماں است (ص ٦٢)

دراصل بی سروساماں است چاہیے، سر کے بعد "است" بے موقع ہے۔

قطب الدین نے حافظ کی پیروی بڑی حد تک کی ہے، متعدد غزلیں حافظ کی زمین میں لکھی ہیں، اور بیسیوں فقرے، ترکیبات حافظ سے نقل کی ہیں، ذیل میں اس سلسلے کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

قطب الدین	حافظ
تا عکس روئے یار درافتد بجام ما	ساقی بنور بادہ برافروز جام ما
ساقی بیار جام می لعل فام ما	مطرب بگو کہ کار جہاں شد بکام ما
داریم امید آنکہ لبالب بود مدام	ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم

قطب الدین	حافظ
خالی نگردد از می عشق تو جام ما	ای بیخبر ز لذت شرب مدام ما
ما را جز ایں ارادہ نباشد کہ دائما	ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق،
اندر حریم وصل تو باشد مقام ما	ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما
چوں قربِ ما ملائکہ دیدند بے گماں	چنداں بود کرشمہ و ناز سہی قداں
ہردم زنند کوس سعادت بنام ما	کاید بجلوہ سرو صنوبر خرام ما
ما ہمنشین یار وفادار گشتہ ایم	ترسم کہ صرفۂ نبرد روز باز خواست
اے بے خبر ز لذت وصل دوام ما (ص ٦)	نان حلال شیخ ز آب حرام ما (ص ۹)

قطب الدین کے سامنے حافظ کی غزل تھی، مگر وہ تتبع کا حق ادا نہ کر سکا، حافظ کی یہ مشہور ترین غزل ہے، جس کے کئی مصرعے و بیت ضرب المثل ہو گئے ہیں، قطب الدین کی آخری بیت میں حافظ کا فقرہ بے سلیقہ استعمال کا نمونہ ہے۔

قطب کی ایک اور غزل حافظ کی غزل کی زمین میں ہے، چند بیتیں ملاحظہ ہوں:

عقل از سرم رمیدہ مجنوں شدم خدارا	دل می رود ز دستم صاحبدلاں خدا را
زنجیر زلفش آرید برپا نہید ما را	دردا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا
شاید بدیں بہانہ بینم جمال دلبر	کشتی شکستگانیم اے باد شرطہ برخیز
او ہم بود کہ داند رسوائے با وفا را	باشد کہ باز بینم دیدار آشنا را
اے عاقلاں کنارہ از من کنید ورنہ	دہ روزہ مہر گردوں افسانہ است و افسوں
چوں درد دل بگویم گریاں کنم شما را	نیکی بجائے یاراں فرصت شمار یارا
مرغ دلم پریدہ جانم بلب رسیدہ	آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
آں یار برگزیدہ شاید کند دوا را	با دوستاں مروت با دشمناں مدارا

در رہگذار جاناں ہر روز آیم از جان　　ہنگام تنگدستی در عیش کوش و مستی
شاید کہ شاہ خوبان بنوازد ایں گدا (ص ۹)　　کایں کیمیائے ہستی قاروں کند گدارا (ص ۵)

حافظ کی غزل ان کی بہترین غزلوں میں ہے، اس کے اکثر ابیات ضرب المثل ہیں، پورے فارسی شعری ادب میں اس غزل کا جواب نہیں ملا، قطب الدین کی پھسپھسی غزل کا کیا ذکر ہے، لیکن بلاشبہہ حافظ کی یہ غزل قطب الدین کے سامنے ہے، چنانچہ حافظ کی دوسری بیت کا مفہوم اس شعر میں ادا کرنے کی نہایت ناکام کوشش ملتی ہے :

کشتیٔ ما شکستہ و بر تختہ پارہ ایم　　اے باد شرطہ بہر چہ استادۂ بیا

ایک اور متوازی غزل ملاحظہ ہو، قطب الدین نے حافظ کا صرف ایک قافیہ باندھا ہے

قطب الدین	حافظ
جز ہوای تو نباشد سر بے ساماں را	رونق عہد شباب است دگر بستاں را
آرزو نیست بجز بزم وصالت جاں را	میرسد مژدۂ گل بلبل خوش الحاں را
کردہ ام عزم طواف حرم کعبۂ تو	ای کہ بر مہ کشی از عنبر سارا چوگاں
راہ بنما بہ سوئے خود من سرگرداں را (ص ۱۵)	مضطرب حال مگرداں من سرگرداں را (ص ۷ - ۸)

جنھوں نے حافظ کی پوری غزل دیکھی ہے وہ بتائیں گے کہ حافظ نے اچھوتے مضامین کے کیسے کیسے موتی بکھیرے ہیں۔

حافظ کی ایک غزل کی زمین میں قطب الدین نے ۲ دو غزلیں لکھیں، دونوں کی چند ابیات حافظ کی ابیات کے بالمقابل نقل ہیں، حافظ کی غزل ۱۲ بیت پر اور قطب کی غزلیں سات سات ابیات پر مشتمل ہیں :

قطب الدین	حافظ
بی ہوای سر کوی تو سری نیست کہ نیست	روشن از پرتو رویت نظری نیست کہ نیست
سوختہ ز آتش عشقت جگری نیست کہ نیست	منت خاک درت بر بصری نیست کہ نیست
ہمہ صاحب نظراں از تو نظر یافتہ آید	ناظر روئے تو صاحب نظرانند آری
نظرت جانب صاحب نظری نیست کہ نیست	سر گیسوئے تو در ہیچ سری نیست کہ نیست
نہ دہد دل کہ کنم سر غم عشقش فاش	اشک غماز من ار سرخ بر آمد چہ عجب
ورنہ در ملک دلم زو خبری نیست کہ نیست (ص ۲۱)	خجل از کردۂ خود پردہ دری نیست کہ نیست
خالی از نشۂ ذوق تو سری نیست کہ نیست	تا بدامن ننشیند ز نسیمش گردی
کشتۂ عشق تو در رہ گذری نیست کہ نیست	سیل خیز از نظرم رہ گذری نیست کہ نیست
بی تو کس کی بسلامت رسد اندر کعبہ	نادم از شام سر زلف تو ہر جا نزنند
کہ بہر گام دراں رہ خطری نیست کہ نیست	با صبا گفت و شنیدم سحری نیست کہ نیست
چونکہ اندر طلبت جملہ جگر ہا خون ست	مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
خالی از خون جگر چشم تری نیست کہ نیست (ص ۶۱)	ورنہ در مجلس رنداں خبری نیست کہ نیست (ص ۵۱)

حافظ کی ایک غزل کی پیروی میں قطب الدین نے ایک غزل لکھی، اس میں آخر الذکر نے حافظ کے کچھ فقرے لیے ہیں، دونوں غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

قطب الدین	حافظ
قاضیٔ روز جزا فتوی ایں قصہ نوشت	عیب رنداں مکن اے زاہد پاکیزہ سرشت
کہ نباشد بہشت آنرا کہ غم عشق بہشت	کہ گناہ دگراں بر تو نخواہند نوشت
نتوانم کہ کنم توبہ ز عشق اے زاہد	من اگر نیکم و گر بد تو برو خود را باش
چہ کنم کلک قضا بر سر من عشق نوشت	ہر کسی آں درود عاقبت کار کہ کشت
کردم از عشق سوالی کہ بگو حق بکجاست	ہمہ کس طالب یارند چہ ہشیار چہ مست
گفت ہر جا طلبی ہست چہ مسجد چہ کنشت	ہمہ جا خانۂ عشق است چہ مسجد چہ کنشت
عشق خیزد ہمگی از سخن قطب الدین	ناامیدم مکن از سابقۂ لطف ازل (ص ۳۵)

گوئی استاد ازل قابلش از عشق سرشت
ہرکسی ہرچہ بکارد بدرود آخر کار
ہیچ چیزے نتواند دروو آنکہ نہ کشت
نیک باید کہ بود باطن مردم ورنہ
صورت ظاہر کس تواہ بود خوب کہ زشت

تو پس پردہ چہ دانی کہ خوبست و کہ زشت
نہ من از پردۂ تقویٰ بدر افتادم و بس
پدرم نیز بہشت ابد از دست بہشت
تسلیم من وخشت درمیکدہ ہا
مدعی گر نہ کند فہم سخن گو سر و خشت
(ص ۵۹)

اس غزل کا مقطع حافظ کی اس معروف بیت سے مستفاد ہے:

درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند آنچہ استاد ازل گفت بگو می گویم (ص ۲۶۲)

غرض واضح ہے کہ قطب الدین کے سامنے حافظ کا دیوان موجود تھا، اور اس دیوان کی جستہ جستہ غزلوں کے جواب میں غزلیں لکھیں۔

قطب کی حسب ذیل غزلیں حافظ کی زمین میں ہیں، دونوں کے مطلع ذیلاً درج ہیں:

قطب الدین (۳۴)
مراکہ ہردم و ہر لحظہ دیدہ خانۂ تست
بہر کدام ہمی پای آشیانۂ تست

حافظ (۲۵)
رواق منظر چشم من آشیانۂ تست
کرم نما و فرود آکہ خانہ خانۂ تست

ذیل کی متوازی غزلوں کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

مرا ز پیر طریقت ہمیں سخن یاد است
کہ رست از دو جہاں ہر کہ از خود آزاد است
ز گیر و دار جہاں دست خویش کوتہ کن
مباش غرہ کہ بنیاد عمر بر باد ست
کجا روم چہ کنم درد خود کرا گویم
چنیں کہ بار تغافل شعار افتادست

بیا کہ قصر امل سخت سست بنیاد ست
بیار بادہ کہ بنیاد عمر بر باد ست
غلام ہمت آنم کہ زیر چرخ کبود
ز ہرچہ رنگ تعلق پذیرد آزاد ست
چہ گویمت کہ بہ میخانہ دوش مست و خراب
سروش عالم غیبم چہ مژدہ ہا داد ست

میان کعبۂ مقصود ما رہیست نہاں
کسے نرفت بسعیٔ خودش خدا دادست
بپیچ سر ز شریعت ہم از طریق ادب
کہ ذوق مرکب ایں راہ تقویت دادست
بروز وصل ز دیدار دوست بستاں داد
تو قطب دیں کہ شہنشاہ حسن بیداد ست (۴۶)

ترا ز کنگرۂ عرش می زنند صفیر
ندانمت کہ دریں دامگہ چہ افتادست
نصیحتی کنمت یاد گیر و در عمل آر
کہ ایں حدیث ز پیر طریقتم یاد ست
غم جہاں مخور و پند من مبر از یاد
کہ ایں لطیفۂ عشقم ز رہروی یادست
مجو درستی عہد از جہان سست نہاد
کہ ایں عجوزہ عروس ہزار داماد ست
(۲۷)

حافظ کی اس معرکۃ الآراء غزل کا جواب قطب الدین سے بن نہ پڑا۔

قطب الدین نے حافظ کی مشہور غزل

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند آیا بود کہ گوشۂ چشمی بما کنند

کی پیروی ردیف میں تھوڑے سے تغیر کے بعد کی ہے:

صاحبدلے اگر نظرے سوئے ما کند مس وجود ما بنظر کیمیا کند

حافظ کی ایک نہایت مشہور غزل "می کرد" ردیف کی پیروی قطب الدین نے کی ہے، دونوں غزلوں کی چند ابیات ملاحظہ ہوں:

دلربائی کہ نظر در ہمہ اشیا می کرد
غائبانہ نظر لطف سوئے ما می کرد
بیگماں بال و پر جملہ ملائک می سوخت
گر برایشاں ہمہ یک راہ تجلا می کرد

سالہا دل طلب جام جم از ما می کرد
وانچہ خود داشت ز بیگانہ تمنا می کرد
گوہری کز صدف کون و مکان بیرون است
طلب از گم شدگان لب دریا می کرد

از تر و خشک دو عالم اثری کی ماند
آتش عشقش اگر جائے بہر جا می کرد
آں نگار از دل ما آئینہ می ساخت نخست
چہرۂ خویش در آئینہ تماشا می کرد
چوں تواں دید دریں روز رخش حیرانم
کہ چرا او عدۂ دید اد بفردا می کرد
آنکہ از قدرت خود صورت نقش کشید
خویشتن را کہ نہاں بود ہویدا می کرد
قطب دیں سر دو عالم بگلِ ماست نہاں
گر بدی جم طلب جام خود از ما می کرد
(ص ۷۵ ـ ۷۶)

مشکل خویش بر پیر مغاں بردم دوش
کو بہ تائید نظر حل معمّا می کرد
دیدمش خرم و خنداں قدحی لالہ بدست
و اندراں آئینہ صد گونہ تماشا می کرد
گفتم ایں جام جہاں بیں بتو کہ داد حکیم
گفت آں روز کہ ایں گنبد مینا می کرد
بیدلی در ہمہ احوال خدا با او بود
او نمی دیدش و از دور خدارا می کرد
ایں ہمہ شعبدۂ خویش کہ می کرد اینجا
سامری پیش عصا و ید بیضا می کرد
گفت آں یار کزو گشت سر دار بلند
جرمش ایں بود کہ اسرار ہویدا می کرد
(۹۶)

حافظ کی اس معروف غزل کی پیروی کی ناکام کوشش قطب الدین نے کی، حافظ کی یہ غزل عرفان و تصوف کے نازک مسائل کی دلنشین تصویر پیش کرتی ہے، جن کا قطب الدین کے یہاں نام و نشان نہیں، آخر الذکر کے مقطع سے صاف ظاہر ہے کہ حافظ کی غزل ان کے پیش نظر تھی۔

ایک متوازی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

منم گدا و توئی پادشاہ بندہ نواز
تو کار بندۂ عاصی بلطف خویش بساز

ہزار شکر کہ دیدم بکام خویشت باز
ز روئے صدق و صفا گشتہ با دلم دمساز

نشستہ بر سر کویت مدام منتظرم
بداں امید کہ چشمم شود برویت باز
نمی کنم بکس اظہار درد عشق ولی
شد اشک سرخ برخسار راز من غماز

اگرچہ حسن تو از عشق غیر مستغنی ست
من آں نیم کہ از عشقبازی آیم باز
چہ گویمت کہ ز سوز دروں چہ می بینم
ز اشک پرس حکایت کہ من نیم غماز

دونوں نے اس زمین میں دو غزلیں[1] لکھیں، یہ غزلیں قطب الدین کے پیش نظر تھیں، اشک سرخ کی توجیہ حافظ کے ایک شعر میں کس خوبصورتی سے ملتی ہے:

اشک غماز من ار سرخ برآید چہ عجب
خجل از کردۂ خود پردہ دری نیست کہ نیست
(ص ۵۱)

حافظ کی ایک مشہور غزل کی پیروی قطب الدین نے کی ہے، اس غزل کے بارے میں ایک افسانوی روایت بھی ہے، کہ حافظ کے یہاں مقطع غزل یہ ہے ؎

گر مسلمانی ازین است کہ حافظ دارد
آہ اگر از پی امروز بود فردائی

اس پر لوگوں کو یہ اعتراض تھا کہ اس شعر سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حافظ کا آخرت پر عقیدہ مشکوک ہے، چنانچہ انھوں نے اس کے پہلے حسب ذیل بیت کا اضافہ کر کے یہ ثابت کیا کہ بیت مذکور ان کا قول نہیں بلکہ کسی ترسا کا ہے:

ایں حدیثم چہ خوش آمد کہ سحرگہ می گفت
بر در میکدہ با دف و نے ترسائی

چند ابیات دونوں متوازی غزلوں سے نقل کیے جاتے ہیں:

---

[1] منم کہ دیدہ بدیدار دوست کردم باز
چہ شکر گویمت اے کارساز بندہ نواز (حافظ)
(۱۷۶)
بروئے ہر کہ در عجز و معرفت شد باز،
تواند آں کہ سوئے یار خود کند پرواز (قطب)
(ص ۱۲۱)

قطب کے یہاں غماز کا قافیہ اس بیت میں ملتا ہے:

عجب مدار کہ رسوائے دہر گردم من
چنیں کہ طفل سر اشکم ہمی شود غماز

کیست کو را بود امروز دل دانائی — در ہمہ دیر مغاں نیست چو من شیدائی

ورد اوراد کند در رہ وصلت پائی — خرقہ جائی گرو بادہ و دستر جائی

از سرای تن خود یادیۂ عشق بپوی — دل کہ آئینۂ شاہیست غباری دارد

کہ اگر مرد رہی باش تو ہم رسوائی — از خدا می طلبم صحبت روشن رائی

اندریں روز بکوش و غم فردا می خور — کردہ ام توبہ بدست صنم بادہ فروش

نیست شک کز پی امروز بود فردائی — کہ دگر می نخورم بی رخ بزم آرائی

(ص ۲۰۲) — (ص ۳۴۹)

حافظ کی غزل دس ابیات پر اور قطب الدین کی صرف چھ۶ بیت پر مشتمل ہے، آخری منقولہ بیت سے واضح ہے کہ آخر الذکر شاعر کے پیش نظر حافظ کی غزل تھی اور اسی کے تتبع میں اس نے یہ غزل لکھی۔

ردیف "یا" کی حسب ذیل دو۲ متوازی غزلیں موجود ہیں، ان کے مطلعے مع حافظ کی غزلوں کے مطلعے ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

ایام گل ارادہ مکن غیر جام مے — ساقی بیا کہ شد قدح لالہ پُر ز مے

ساقی بجوے نغمۂ چنگ و رباب نے — طامات بچند و خرافات تا بہ کے

(ص ۲۰۰) — (حافظ ص ۲۹۷)

رسید فصل بہاراں گذشت حیلۂ دی — بصوت بلبل و قمری اگر نہ نوشی مے

خوش است جام مے از دست یار پی در پی — علاج کی کنمت آخر الدواء الکی

(ص ۱۹۷) — (حافظ ص ۲۹۸)

حافظ اور قطب الدین کی متوازی غزلوں کے مقطعے ملاحظہ ہوں:

در عشق تو ہر کہ نام دارد — آں کس کہ بدست جام دارد

در بندگی اہتمام دارد — سلطانی جم مدام دارد

(دیوان قطب ۱۰۳) — (حافظ ص ۱۴۹)

حافظ کی ایک دلپسند غزل "غم مخور" ردیف کی ہے، اس کی پیروی قطب الدین نے کی، حافظ کی غزل ۱۰ بیت پر اور آخر الذکر کی حسب دستور ۷ بیت پر مشتمل ہے، چند بیت ملاحظہ ہوں:

قطب	حافظ
اے دل ار دوری تو از دیدار جاناں غم مخور	یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور
درد تو شاید رسد روزی بدرماں غم مخور	کلبۂ احزاں شود روزی گلستاں غم مخور
مدتی گر زیر بار ہجر باشی پائمال	ہاں مشو نومید چوں واقف نۂ از سر غیب
عاقبت گردی خلاص از بار ہجراں غم مخور	باشد اندر پردہ بازیہای پنہاں غم مخور
دور ازاں دلبر اگر کارت بود یکسر خراب	در بیابان گر بشوق کعبہ خواہی زد قدم
کار تو سازد خدائے کارگرداں غم مخور	سرزنشہا گر کند خار مغیلاں غم مخور
گر ہمی خواہی طواف کعبۂ مقصود خویش	گرچہ منزل بس خطرناک است و مقصد بس بعید
در بیاباں غم از خار مغیلاں غم مخور	ہیچ راہی نیست کاں را نیست پایاں غم مخور
(قطب ص ۱۱۰)	(دیوان ۱۷۲)

واضح ہے کہ قطب الدین کے پیش نظر حافظ کی غزل تھی، چنانچہ حافظ کی آخری بیت کی صدائے بازگشت نہ صرف اس غزل میں بلکہ اور غزلوں میں بھی موجود ہے، مثلاً:

ہر کہ کردہ سفر بادیۂ کعبۂ دوست — کی غم سرزنش خار مغیلاں دارد (۱۰۴)

ہر کہ رو اندر طواف کعبہ کرد — کی غم خار مغیلانش بود (۹۷)

در تمنائے وصال کعبۂ دیدار یار — در بیابان غمش خار مغیلاں تا بکی (۲۰۷)

"کلبۂ احزان" کئی بار استعمال ہوا ہے:

ہمچو یعقوب از فراق یوسف گل پیرہن   دیدہ ہا گریاں بہ کنج بیت الاحزاں تا بکی (۲۰۷)

بی جمالت نیست روشن کلبۂ احزان من   ساز روشن کلبہ ام ای شاہ خوباں الغیاث (۶۵)

"راہ بی پایان" کا استعمال دیکھیے:

راہ ہا جملہ پایانی بود   راہ ما نیست پایاں مشکل است (۵۳)

ایک متوازی خط کے مطلعے ملاحظہ کیجیے:

اگر تو سالک عشقی بہ چستی و چالاک   ہزار دشمنم ار می کنند قصد ہلاک

بنہ بجنگ در دوست روئے خود بخاک (ص ۱۴۱)   گرم تو دوستی از دشمناں ندارم باک (ص ۲۰۴)

حافظ نے ایک زمین میں دو غزلیں لکھیں، قطب الدین نے ایک غزل ان کی پیروی میں لکھی:

فاش می گویم و خواہم نرود از یادم   فاش می گویم و از گفتۂ خود دلشادم

کہ بہ سودای غم عشق تو مادر زادم   بندۂ عشقم و از ہر دو جہاں آزادم

در ازل پردگی خلوت جاناں بودم   طائر گلشن قدسم چہ دہم شرح فراق

کز حریمش بہ چنیں دور و دراز افتادم   کہ دریں دامگہ حادثہ چوں افتادم

ایں چنیں کز شرر عشق دلم می سوزد   من ملک بودم و فردوس بریں جایم بود

عاقبت در غم عشق دہد بر بادم   آدم آورد دریں دیر خراب آبادم

یا ز کز دولت دیدار مرا بنوازد   کوکب بخت مرا ہیچ منجم نشناخت

من اگر سیر نخواہم برد بنیادم   یارب از مادر گیتی بچہ طالع زادم

قطب دریں غم نخورد ہر کہ خورد گو می خور   پاک کن چہرۂ حافظ بسر زلف ز اشک

من بسودای غمش از دو جہاں آزادم   ورنہ ایں سیل دمادم ببرد بنیادم

(ص ۱۶۲ - ۱۶۳)   (ص ۲۱۶)

دونوں کی ایک اور غزل اسی زمین میں ہے، ان کے چند شعر یہ ہیں:

زلف بر باد مدہ تا ندہی بر بادم   ناز بنیاد مکن تا نکنی بنیادم

می مخور با ہمہ کس تا نخورم خون جگر   سر مکش تا نکشد سر بفلک فریادم

زلف را حلقہ مکن تا نہ کنی در بندم   طرہ را تاب مدہ تا ندہی بر بادم

(حافظ ص ۲۱۵)

تا من دل شدہ از مادر گیتی زادم   عشق در بادیۂ وصل تو شد استادم

حلقۂ بندگیت تا کہ کشیدم در گوش   از غم سود و زیان دو جہاں آزادم

زلف بر باد مدہ زانکہ دلم بستۂ اوست   ورنہ چوں زلف پریشاں بدہی بر بادم

(قطب ص ۱۶۴)

دیوان قطب الدین میں بعض الفاظ، تراکیب اور فقرات جو حافظ کے یہاں سے اخذ کیے ہوئے ہیں ان کی نشاندہی کی جاتی ہے:

قطب الدین	حافظ
ببیں کہ تا بکجا رفت تیر ہمت ما (۱۴)	ببیں تفاوت رہ کز کجاست تا بکجا (۳)
ہزار جان گرامی فدا کند بہ بہت (۲۷)	ہزار جان گرامی فدای جانانہ
ہمای اوج عزت بر سر ماست (۳۱)	ہمای اوج سعادت بدام ما افتد (۷۷)
بار وصلش کا سماں آن بار را طاقت نداشت (۵۵)	آسماں بار امانت نتوانست کشید (۱۲۵)
بہ می سجادہ بفروش و بزن تسبیح آتش را (۳)	بہ می سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید (ص ۲)
بدیں راہ درویش میرو حد شیم مختصر باشد (۷۳)	بدیں راہ و روش می رو کہ با دلدار پیوندی (۳۰۶)
وز ندارد طلب وصل تو نادرویش است (۶۲)	تا دریں خرقہ ندانی کہ چہ نادرویشم

عزیز من بشنو ایں سخن ز قطب الدین
مباش در پی آزار بندگان خدای
(دیوان ص ۲۰۴)

مباش در پی آزار و هرچه خواهی کن
که در شریعت ما غیر ازیں گناہے نیست
(حافظ ص ۵۳)

ہمیں کہ فتنۂ آخر زمان علم برداشت
مراز فتنۂ آخر زمان نگہداری
(ص ۲۰۵)

خواہم شدن بکوی مغان آستیں نشان
زین فتنہ ہا کہ دامن آخر زماں گرفت
(ایضاً ص ۶۰)

ازاں زماں کہ فتنۂ چشمت بمن رسید
ایمن ز شر فتنۂ آخر زماں شدم
(ص ۲۱۶)

اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ دیوان قطب الدین کا خواجہ بختیار کاکی سے کوئی تعلق نہیں، دراصل نام کی یکسانی سے دھوکا ہوا، اول الذکر گیارہویں بلکہ بارہویں صدی کا شاعر معلوم ہوتا ہے، خواجہ بختیار کی طرف اس دیوان کا انتساب غلط ہے، اور یہ نتیجہ قطعی اور شبہ سے پاک ہے، اس امر کی پہلی دلیل یہ ہے کہ قطب الدین نے حافظ کی قدم قدم پر پیروی کی ہے، حافظ کی وفات ۷۹۲ھ میں اور خواجہ بختیار کی ۶۳۴ھ میں، حافظ سے تقریباً ۱۵۸ سال پہلے، پس حافظ کا پیرو ساتویں صدی کا شاعر نہیں ہوسکتا، ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ اس کا بھی تو امکان ہے کہ حافظ نے قطب الدین کی پیروی کی ہو مگر یہ وسوسہ بے بنیاد ہوگا، حافظ نابغۂ روزگار تھا، قطب الدین معمولی درجے کا شاعر، ایسا نہیں ہوسکتا ہے کہ حافظ ایسے معمولی درجے کے شاعر کو اپنا پیش رو بناتا، پس مسلمہ بات یہی ہے کہ قطب الدین نے حافظ کی پیروی کی ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ قطب الدین کی زبان جدید تر ہے جس کو فارسی زبان شناسی کا ذرا سا ملکہ ہوگا وہ بتا دے گا کہ قطب الدین کا کلام اوائل ساتویں صدی ہجری کا ہو ہی نہیں سکتا، اس میں سیکڑوں الفاظ، فقرات و ترکیبات ہیں جو ساتویں صدی سے قبل فارسی میں ناپید تھے، میں نے ابتداء میں چند مثالیں دی ہیں، ابھی یہ کام ادھورا ہے، دیوان قطب الدین کے لفظیات کا عمیق مطالعہ ہو تو یہ بات اور زیادہ یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے، غزلیات قطب الدین کا سبک قدیم سبک نہیں، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی ساتویں صدی کے اوائل کے ہیں، اول الذکر کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ غزل کے اس دور کی نمایندگی کرتا ہے جس پر کئی صدیاں گذر چکی ہیں، اس سے اس سبک کی نمایندگی نہیں ہوتی جو سعدی شیرازی سے نصف صدی قبل رائج تھا،

تیسری دلیل یہ ہے کہ خواجہ بختیار کاکی خواجہ معین الدین چشتی کے اجل خلفاء میں تھے، بڑے بلند مرتبہ کے عارف تھے، فنافی اللہ، ایسے فنافی اللہ کہ خواجہ احمد جام کے حسب ذیل شعر سے اتنے متاثر ہوئے کہ اسی میں ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی:

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را — ہر زماں از غیب جانے دیگر است

قطب الدین کے کلام سے ظاہر ہے کہ اس کو تصوف و عرفان سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا وہ کٹر سنی عقائد کا حامل ہے، اور دوسرے عقیدے کے لوگوں کو بے ایمان اور بدعقیدہ اور جہنمی سمجھتا ہے جو صوفی آداب کے خلاف ہے، حسب ذیل اشعار سے میرے قیاس کی تائید ہوتی ہے:

یاران تو چار آمدند پاکیزہ کردار آمدند — گلہائے بے خار آمدند از خویش فانی باغ را
اول ابوبکر تقی در دین و دنیا بد نقی — اعدائے او باشد شقی آں جملہ را دوزخ سزا

او مظہر رحمٰن بود شمع ہمہ خوباں بود — اعداش بے ایماں بود ہستم غلامش بی ابا

از خویشتن بگسستہ بُد بایاد حق پیوستہ بُد — بر جائے تو بنشستہ بُد دہ سال دو مہ پیشوا

دہ سال و شش ماہ دگر بر جائے تو بود عمر — وز نور عدلش چوں قمر بگرفت عالم را ضیا

ہر کس کہ بر باطل بود واز حالِ او غافل بود — وآنکس کز اہل دین بود داند مرا ورا مقتدا

دین خدا مطلق گرفت اسلام زور ونق گرفت — جائے ترا بر حق گرفت آں حق شناس ورہ نما

عثمان پاکیزہ گہر دہ سال و دو سالِ دگر — بر جائے پاکت بی ضرر بنشست از بہر خدا

او حیم بُد تو جان ور در راضی بُدی دائم ازو — دوبارہ شد داماد تو آں منظہر علم و حیا

اعدائے او را روسیہ اعمال شاں جملہ تبہ — سرتا بپا غرق گنہ باشد جہنم شاں جزا

ایام یار چار دین کاندر طریقت بُد امین — بُد چار سال او ہمیں یعنی علی مرتضا

غرض قرائن ابلا سے یہ بات یقینی ہے کہ قطب الدین جس کا دیوان زیر مطالعہ ہے وہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے جدا ہے، دراصل ادنی سے قرینہ پر دو شخصیتوں میں التباس عام ہے، دیوان قطب الدین مطبع نول کشور والوں کو ملا تو انھوں نے اس کو آسانی سے ایک بڑی ہمنام شخصیت یعنی خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی طرف منسوب کر دیا، اور ان کے نام سے چھاپ کر عام کر دیا، اس ادارہ جہاں ادبی خدمت ملحوظ تھی وہیں دینی اور مذہبی خدمت کا بھی جذبہ تھا، بعینہ یہی صورت دیوان معین الدین کے ساتھ بھی ہوئی نول کشور پریس میں دیوان مذکور خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے نام سے چھاپ دیا گیا، اور مدتوں یہ دیوان انہی کا سمجھا جاتا رہا، خدا جزائے خیر دے پروفیسر حافظ محمود شیرانی کو جنھوں نے سمجھا نپ لیا کہ یہ دیوان حضرت کا نہیں بلکہ معین الدین فراہی کا ہے، جو معین مسکین و معین تخلص سے شعر کہتے تھے، فراہی مشہور شاعر، ادیب، مفسر اور سیرت نگار تھے، متعدد کتابیں انھوں نے

تصنیف کیں، اور ان میں سے اکثر محفوظ ہیں، ان کی معارج النبوۃ سیرت پر اہم تصنیف ہے، ان کی نثری تصانیف میں قدم قدم پر اپنے اشعار نقل کیے ہیں، ان میں بیشتر وہی ہیں جو دیوان میں پائے جاتے ہیں، ان کے پوتے نے اخلاق جہانگیری نام کی ایک کتاب لکھی، اس میں بھی دیوان کے اشعار منقول ہیں، غرض داخلی اور خارجی شہادتوں سے قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ دیوان معین، معین مسکین فراہی کا ہے، خواجہ معین الدین چشتی کا نہیں، البتہ آخر الذکر کے نام سے چھپ گیا، جس کی بنا پر بڑی گمراہی پھیلی۔

میری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ دیوان قطب الدین کا مشہور صوفی بزرگ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے کوئی تعلق نہیں، یہ ان کے ہمنام کسی بہت بعد کے شاعر کا ہے نام کی یکسانی کی وجہ سے یہ دیوان بختیار کاکی کا سمجھا جانے لگا ہے، لیکن اندرونی شہادت سے اس قیاس کی تردید ہو جاتی ہے۔

اورنگ زیب کی ہجو سے مدح تک

نعمت خاں عالی کا ذہنی و فکری سفر

از ڈاکٹر عبدالرب عرفان (کامٹی) صدر شعبۂ اردو و فارسی انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز ناگپور

نعمت خاں عالی[1] عالمگیری عہد کا فقید النظیر عالم، خوش فکر شاعر، صاحب طرز نثر نگار اور ممتاز انشاپرداز تھا۔ اس کی شاعرانہ حیثیت کے معتبر ہونے کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ اس کے عہد کا عظیم ایرانی شاعر صائب تبریزی (متوفی ۱۰۸۰ھ) اس کے پاس اپنی غزلیں بھیجتا اور عالی ان پر جوابی غزلیں کہتا تھا۔[2] علم و فضل میں اس کی قدر آور شخصیت کا اعتراف ارباب تذکرہ نے "حاوی فنون وافر و جامع علوم متکاثر"[3] "جامع فنون کمال و اعجوبۂ عدیم المثال"[4] "با حراز علوم متکاثرہ منفرد زمان و در تکمیل فنون شتی متوحد آوان"[5] "پیشوای صاحب کمالان زمانہ و در معقول و منقول استاد یگانہ"[6] "در فضایل و کمالات از مستعدان زمان و در انواع

---

[1] نام نورالدین محمد تخلص اول حکیم اور تخلص ثانی عالی، خطابات نعمت خاں، مقرب خاں اور دانشمند خاں۔ اول الذکر دو خطابات حضرت اورنگ زیب نے ارزانی فرمائے اور آخر الذکر انکے جانشین بہادر شاہ اول نے۔ شہرت خطاب اور تخلص ثانی سے ہوئی

[2] بطور ثبوت صرف ایک غزل کا مقطع پیش کیا جاتا ہے:

صائب نوشت این غزل تازہ را بمن　　عالی گرفت نسخہ جوابی کہ جادہ شد　　(دیوان عالی نولکشور، ص ۱۰۲)

[3] سرو آزاد، آزاد بلگرامی، حیدرآباد دکن ۱۹۱۳: ص ۱۳۶ [4] خزانۂ عامرہ، آزاد بلگرامی، مطبع نولکشور کانپور ۱۹۰۰ء: ص ۳۳۳ [5] بہارستان سخن: نواب صمصام الدولہ، مدراس ۱۹۵۸ء: ص ۶۲۴ [6] ید بیضا: آزاد بلگرامی، مخطوطہ نمبر ۳۰۹۴، سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد: ورق ۱۹۹ الف۔

فنون شعر و انشا، محسود اقران"[1] جیسے پرشکوہ الفاظ میں کیا ہے۔ خود عالی نے بھی ایک رباعی میں "ناخواندہ نماند ہیچ علمی" کا دعویٰ اور "سواد خط پیشانی" سے اپنی محرومی پر تاسف کا اظہار کیا ہے۔[2] یہ محض خود ستائی نہیں، خود اس کی نگارشات سے بھی متنوع علوم و فنون پر اس کی مستحکم گرفت کا مکمل ثبوت ملتا ہے۔ باایں ہمہ اس کی ہمہ گیر علمی اور ادبی شخصیت کا المیہ یہ ہے کہ ہندوستان کی فارسی ادب کی تاریخ میں اس کی شناخت ایک ایسے ہجو نگار کی حیثیت سے متعین ہوئی جس کا "خامۂ ہجو شمشیر خونریز بلکہ صور قیامت انگیز" واقع ہوا تھا۔[3] اس کی ہجو نگاری کی تحسین و ستائش میں تذکرہ نگاروں نے کچھ ایسا انداز اختیار کیا ہے، جس سے عالی کے اصلاً اور اساساً ہجو گو ہونے کا تاثر ملتا ہے۔ کسی نے ان اسباب و عوامل کی جانب اشارہ تک نہیں کیا جو عالی جیسے متبحر عالم کو ہندوستان کا عبید زاکانی[4] بنانے کے ذمہ دار رہے ہیں۔

قابل ذکر و توجہ پہلو یہ ہے کہ عالی نے معاشرے کے صرف دو طبقوں (ارباب ارکان

---

[1] کلمات الشعرا: محمد افضل سرخوش، مخطوطہ نمبر ۱۱۸۰۵، آصفیہ لائبریری حیدرآباد: ورق ۱۶۱ الف

[2] دیوان نعمت خان عالی، مطبع نولکشور ۱۸۹۴ء: ص ۲۱۵ [3] خزانۂ عامرہ، مطبع نولکشور: ص ۳۳۳

[4] شاہ ابو اسحق اینجو کا ہمعصر تھا اور فضل و کمال میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ درباری شعرا کے زمرے میں شمولیت کی غرض سے بادشاہ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا۔ جب پیش کرنے گیا تو معلوم ہوا کہ بادشاہ مسخروں کی بذلہ سنجیوں سے محظوظ ہو رہا ہے اور باریابی ممکن نہیں۔ اسی وقت اس نے جبہ و دستار کو خیرباد کہا اور قطعہ ذیل کہہ کر اس پر عمل پیرا ہو گیا:

ای خواجہ مکن تا بتوانی طلب علم　　کاندر طلب راتب ہر روزہ بمانی

رو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز　　تا داد خود از مہتر و کہتر بستانی

حکومت اور اطبا) کے منتخب افراد کو اپنے طنز و ملامت کے تیروں کا ہدف بنایا ہے۔
اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے ہجو گوئی اور ہرزہ سرائی کی راہ پر لگانے والے اہم عوامل میں اس کے علم و فن کی ناقدری کا احساس اور معاصرانہ چشمک تھے۔ عالی ایک ایسے مسابقتی دور کی فضا میں سانس لے رہا تھا جس میں شاہی دربار ارباب علم و فن کا کعبۂ مراد تصور کیا جاتا تھا۔ اپنی علمی اور ادبی زندگی کے ابتدائی برسوں میں وہ اپنے فضل و کمال کی عدم پذیرائی اور شاہی خدمت و منصب سے محرومی کے احساس کا بوجھ ڈھوتا رہا۔ بسر اوقات کے لیے طبابت کا پیشہ اختیار کیا تو حریفوں نے قدم نہیں جمنے دیئے ناچار "بیماری علاج بیماراں" سے شفا پائی۔[1] ترک طبابت کے بعد مقدر سے شہزادی زیب النسا بیگم (دختر حضرت اورنگ زیبؒ) کی بارگاہ میں لے گیا۔ وہاں بھی تنگ دستی کے ہاتھوں اپنا جیغۂ مرصع فروخت کے لیے شاہزادی کی خدمت میں بھیجنے پر مجبور ہوا[2]۔ ان حالات میں اس کا تلخ نوائی پر اتر آنا کوئی غیر فطری اور تعجب خیز امر نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ ہر گذرنے والے پل کے ساتھ اس کی نوا تلخ تر ہوتی گئی۔ وہ اپنے گرد و پیش کے ماحول سے ناکامیوں اور نامرادیوں کے احساسات و تجربات سمیٹتا ہوا اور اپنے لہجے میں زہر گھولتا ہوا ایک ایسا بے باک اور دریدہ دہن ہجو گو بن گیا جس کی بے محابا اور برملا ہرزہ سرائی نے حضرت اورنگ زیبؒ کو بھی نہیں بخشا اور ان کی بھی عالی ظرفی اور

[1] دیوان نعمت خاں عالی موسوم بہ خوان نعمت (دیباچہ) مخطوطہ نمبر ۲۱۷، سالار جنگ میوزیم، حیدر آباد: ورق ۱۱۲ الف
[2] جب جیغے کی قیمت ایک عرصے تک وصول نہیں ہوئی تو عالی نے درج ذیل قطعہ لکھ کر بھجوایا:

ای بندگیت سعادت اختر من ۔۔۔ درخدمت تو عیان شدہ جوہر من
گر جیغہ خریدنی ست پس کو زر من ۔۔۔ ورنیست خریدنی بزن بر سر من

(دیوان عالی، نولکشور: ص ۲۱۷)

علم و بردباری کا امتحان لے ڈالا۔

جہاں تک حضرت اورنگ زیبؒ کی شان میں عالی کی گستاخانہ روش کا تعلق ہے، قرائن پتا دیتے ہیں کہ اس کے محرکات میں اختلاف عقاید سے پیدا شدہ غلط فہمیں کو بھی خاصا دخل رہا ہے۔ حضرت اورنگ زیبؒ اپنے تسنن اور تشرع میں جس قدر راسخ تھے اسی قدر عالی اپنے تشیع میں متقشف واقع ہوا تھا۔ گو اسے حضرت اورنگ زیبؒ نے ۱۰۹۲ھ میں پانچ صدی منصب سے سرفراز اور وقایع نویسی کی خدمت پر مامور فرما دیا تھا[1]۔ مگر وہ اپنی اس حیثیت سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ بعض نام نہاد علما ثقہ عالموں کی سی وضع قطع اختیار کیے ہوئے اپنی تقویٰ فروشی کے طفیل میں بلند تر مناصب پر فائز ہیں۔ اس کی مجروح انا نے اس صورت حال کو بادشاہ کے تعصب پر محمول کیا۔ لیکن جب اس پر حقیقت حال روشن ہوئی تو وہ نہ صرف حضرت اورنگ زیبؒ کی ہجو سے تائب اور دستکش ہو گیا بلکہ ان کا بے لوث مداح بھی بن گیا۔ اس کے ہر دو ذہنی رویوں (یعنی حضرت اورنگ زیبؒ کی ہجو اور پھر ان کی مدح) کا تجزیہ اگر ایک جانب حضرت اورنگ زیبؒ کی مردم شناسی، رواداری، حلم و بردباری، صبر و تحمل، اغماض و چشم پوشی اور بے مثل عالی ظرفی کا پورا ثبوت بہم پہنچاتا ہے تو دوسری جانب عالی کی بے باکی، بے ریائی اور بے غرضی پر بھی دلالت کرتا ہے۔

ہجو اورنگ زیبؒ

حضرت اورنگ زیبؒ کی ہجو میں عالی نے جس ہرزہ سرائی اور دریدہ دہنی کا ثبوت دیا ہے وہ اس کے لیے باعث ننگ اور اس کی علمی و ذہنی شخصیت کی پیشانی پر ایک انمٹ بدنما داغ ہے۔ اس کی ہجو کا بنیادی سبب جیسا کہ سطور بالا میں

[1] گل رعنا، لچھمی نرائن شفیق، مخطوطہ نمبر ۳۰۸۱، سالار جنگ میوزیم حیدر آباد: ورق ۲۴۸ب

بیان کیا جا چکا ہے اس کے فضل و کمال کی ناقدری رہی ہے جسے وہ بالواسطہ اپنے اور بادشاہ کے درمیان اختلاف عقاید کا نتیجہ سمجھتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عالی کا تشیع شاہی خدمت پر اس کی ماموریت کے بعد کم و بیش آٹھ برسوں تک بعض غلط فہمیوں کے باعث عالمگیری تسنن سے ہم آویز رہا۔ اس آویزش کا سلسلہ تقریباً ۱۱۰۰ھ تک قایم رہا۔ اس معروضے کی تایید میں محاصرۂ گولکنڈہ کے دوران عالی کے طرز فکر اور طرز عمل کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ جب حضرت اورنگ زیبؒ نے والی حیدرآباد ابوالحسن تاناشاہ کی منفی و دشمن سرگرمیوں سے مجبور ہو کر ۱۰۹۸ھ میں گولکنڈہ کا محاصرہ کر لیا تو ان کی ہجو میں عالی کے قلم کی کاٹ اور نشتریت اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ اسے یہ تو یاد رہا کہ ایک شیعہ ریاست تباہی و بربادی کے دہانے پر کھڑی ہے لیکن ان اسباب سے چشم پوشی کی جن کے باعث حضرت اورنگ زیبؒ کو اس کے استیصال پر مجبور ہونا پڑا۔

گولکنڈہ کے طویل محاصرے (۲۴ ربیع الاول ۱۰۹۸ھ تا ۲۴ ذی القعدہ ۱۰۹۸ھ) کے دوران عالی نے اپنی کتاب "وقایع" تصنیف کی۔ یہ کتاب وسط رجب (۱۰۹۸ھ) سے اواخر شعبان اور بعض نسخوں کے مطابق ۸ رمضان (۱۰۹۸ھ) تک کے صرف آٹھ مختلف دنوں کی پیش قدمی و پسپائی، زد و خورد اور جدال و قتال کی روداد پر محتوی ہے جو عالی کے یک طرفہ اور جانب دارانہ رخ اپنانے کے نتیجے میں حضرت اورنگ زیبؒ ان کے امرا اور فوجی افسروں کی ہجو ملیح اور عالمگیری لشکر کی ابتری اور زبوں حالی کی غلو آمیز داستان بن کر رہ گئی ہے۔

حضرت اورنگ زیبؒ کی شان میں عالی کی مذموم گستاخیوں کی مثالیں پیش کرنے

میں راقم کا قلم متامل ہے۔ اس دیندار، تقویٰ شعار، رعیت پرور، عدل گستر، خوش صفات، ستودہ خصال اور پاک طینت فرماں روا کے بارے میں جس نے اپنے حسن تدبر اور کردار و عمل سے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کے دور خلافت کی یاد تازہ کر دی، کوئی نازیبا حرف لکھنا سوئے ادب کے مترادف ہے لیکن نفس موضوع کے علاوہ بعض اہم اور ضروری نکات کی وضاحت کے لیے چند مثالوں کا ایراد ناگزیر ہے لہذا اس جواز کے ساتھ کہ "نقل کفر کفر نباشد" چند مثالیں بادل نخواستہ پیش کی جاتی ہیں۔

عالی ۵ رجب (۱۰۹۸ھ) کے کوائف میں لکھتا ہے: "اسی روز بادشاہ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ درگاہ سلاطین سجدہ گاہ کے بندوں کو حملے کے وقت سیڑھی پر چڑھنے کے سلسلے میں کچھ عملی ہدایات دینا ضروری ہے تاکہ وہ زینہ طے کرنے فصیل پر پہونچنے اور نیچے جست لگانے میں ان کے لیے دلیری کا موجب بنیں۔ چنانچہ بادشاہ کے حکم سے اساس خلافت کے مانند محکم ایک نردبان ایک خیمے کے ستون سے نصب کر دی گئی بطور ـــــ:

"خود بنفس نفیس، ہمچو حضرت کلیم کہ بر طور سینا برآید یا خود جناب مسیح کہ بر فلک عروج فرماید، بالا رفتہ مانند شدید القویٰ[1] کہ از فوق سما بر سطح غبرا ہبوط نماید، پایین آمدند۔ درآن صعود[2] محمود و ورود[3] مسعود سرعتی شایان عالم عالم تحسین و جراتی خواہان جہان جہان آفرین

"(بادشاہ) بنفس نفیس حضرت کلیم کی طرح جو طور سینا پر جاتے ہیں یا جناب مسیح کی طرح جو آسمان پر عروج فرماتے ہیں اوپر جا کر حضرت جبرئیل کی طرح جو اوج فلک سے سطح زمین پر نزول فرماتے ہیں، نیچے اتر آئے۔ اس قابل ستایش عروج اور مبارک ورود کے دوران شایان شان سرعت پر عالم عالم تحسین اور مطلوبہ جرات

---

[1] مراد حضرت جبرئیلؑ [2] بلندی پر جانا [3] نیچے اترنا۔

بمنصۂ ظہور آمد۔ بی تکلف از آن حرکت کہ چشم کواکب را در حدقۂ تدویر حیرت نشاند جنس عرض را بر نوع جوہر تقدم بالشرف لازم آمد۔ باین سند کہ در اتمام طی نردبان یک زینہ درمیان ماند بر مذہب نظام[1] کہ بطفرہ[2] قایل است برہان سلم مسلم شد[3]۔

پر جہاں جہاں آفرین کا اظہار کیا گیا۔ بلا تکلف اس حرکت سے جس نے ستاروں کی آنکھ کو حیرت کے دائرے کی پتلی میں بٹھا دیا، عرض کو جوہر پر بلحاظ شرف برتری لازم آئی اور اس سند پر کہ پوری سیڑھی طے ہونے میں ایک زینہ باقی رہ گیا، نظام کے مذہب پر جو طفرہ کا قایل ہے، سلمی دلیل مسلم ہو گئی۔"

یہ ایک معمولی سے واقعے کا ہجویہ اور طنز و ظرافت آمیز بیان ہے جس میں گوناگوں صنعتوں اور علمی اصطلاحوں کے معنی خیز استعمال سے حضرت اورنگ زیبؒ کی تضحیک کا پہلو پیدا کیا گیا ہے۔ ان کے پیروں کی لغزش اور زینے سے اتر آنے کی یہ تاویل کہ معتزلہ کے عقیدۂ طفرہ پر سلم کی دلیل مسلم ہو گئی، ان کے راسخ حنفی عقاید پر زبردست چوٹ ہے۔ مسلم اور سلم کتابوں کے نام بھی ہیں جن کے ساتھ "طفرہ" اور "برہان" کا کنایہ آمیز ایراد بھی ہجو کے رنگ کو گہرا کرتا ہے۔

حضرت اورنگ زیبؒ کی شخصیت کے دینی پہلو پر اس سے زیادہ چبھتے ہوئے طنز کی مثال ملاحظہ فرمایئے:

گولکنڈہ کے محاصرے کے دوران اکثر یوں ہوا کہ مغل فوجیں محصورین پر غلبہ پاتی

---

[1] فرقۂ معتزلہ کا ایک شخص جو اجزا کی عدم تناہی کے باب میں حکما سے اتفاق رائے رکھتا تھا سوائے اسکے کہ وہ قوت و فعل میں تفریق کا قایل نہیں تھا۔ اسکا عقیدہ تھا کہ جسم کے اجزا لا متناہی ہیں۔ [2] اجزائے جسم کے اجزائے مسافت سے مقابل ہوئے بغیر قطع مسافت کو طفرہ کہتے ہیں۔ "عنصر دانش" کے مطابق حکما کی اصطلاح میں حصول مطلب کیلئے طویل فاصلہ توقف کیے بغیر طے کرنے کو کہتے ہیں جسے محال مانا گیا ہے۔ اس نظریے کا بطلان سلمی دلیل سے کیا گیا ہے جکی صورت یہ ہے: △ [3] وقایع، نعمت خاں عالی، راتھفلڈ اڈیشن، کلکتہ ۱۹۱۵ء، ص ۲۰-۲۱۔

نظر آئیں لیکن عین اس وقت جب کامیابی سے ہمکنار ہونے کے امکانات روشن ہوتے کسی نہ کسی سبب سے انھیں اچانک پسپائی اور ناکامی کی صورت دیکھنی پڑتی۔ عالی انتہائی زہرناک اور طنز آمیز لہجے میں صورت حالات کی تاویل ان الفاظ میں کرتا ہے:

زہی دین داری و حبذا زہد شعاری کہ ہرگاہ امیدی بمغلوب شدن عصات بدذات بہم می رسد..... نظر بر حسن تدبیر کہ مبادا جہاد آخر شود و بقیۂ عمر بی غزا بگذرد، فی الحال رای جہان آرای ثواب طلب و صواب مطلب بمنطق اصابت ضمیر تقضا تدبیر..... تبشکلی بدیہۃ الانتاج از مقدم سرداری طفلی جنگ نادیدہ و تالی کمک کردن فوجی گریز ورزیدہ ترتیب می دہد تا نتیجۂ قضیہ منعکس باشد۔ می توان دریافت کہ مطمح نظر تقدس مظہر اگر نہ این لطیفہ از معجزۂ عجیبہ باشد دور یا تسلسل انجامد[1]۔

تحسین اس دینداری پر اور آفرین اس زہد شعاری پر کہ جب کبھی بدذات عاصیوں کے مغلوب ہونے کی امید بندھتی ہے..... اس حسن تدبیر کے پیش نظر کہ کہیں جہاد ختم نہ ہو جائے اور باقی عمر غزا کے بغیر گذرے، اسی وقت اس طالب ثواب اور درست کار کی دنیا کو آراستہ کرنے والی رائے اسکی تقضائے تدبیر ضمیر کی درست آواز پر ایک جنگ نادیدہ بچے کو آگے لڑنے والی فوج کا سردار بنا کر اور اسکی کمک پر فرار ہونے والی ایک فوج مقرر کرکے ایک نتیجہ خیز صورت پیدا کرتی ہے تاکہ جنگ کا نتیجہ برعکس ہو۔ سمجھا جا سکتا ہے کہ نگاہ تقدس پناہ کا مقصد اگر یہ لطیف بات نہ ہوتی جو عجیب معجزہ ہے تو زمانے کا تسلسل قایم نہ رہتا۔

حسن تعلیل کے پیرائے میں حضرت اورنگ زیبؒ کی دینداری اور تقویٰ شعاری پر اس سے زیادہ تیکھے طنز اور زبردست حملے کی مثال عالی کے انبار ہجویات میں شاید ہی ملے۔

---

[1] وقایع، راتھفلڈ اڈیشن: ص ۸-۱۱۷

بالخصوص آخری حملے میں مغل فوجوں کی پے در پے ناکامیوں کی یہ توجیہ کہ حضرت اورنگ زیبؒ کے اسی "معجزہ عجیبہ" پر زحانے کے تسلسل کا انحصار ہے اپنی تہ در تہ معنویت کے دامن میں طنز کی بے پناہ تلخی اور قیامت کی زہرناکی سمیٹے ہوئے ہے۔

"وقایع" میں نصاب الصبیان کے طرز کی نظمیں، ایک قصیدۂ شہر آشوب، انی رائے کا فرضی مرثیہ، قطعات، رباعیاں اور مفرد اشعار بھی شامل ہیں۔ ان میں بھی حضرت اورنگ زیبؒ اور ان کے امرا کی ہجو کی گئی ہے۔ مثلاً چند شعر ملاحظہ فرمائیں:

اله است والله و رحمان خدا ای	مگر او کند رحم بر فوج شاه (ص ۱۱)
چو جنت بهشت، آخرت آن سرای	نصیبِ کسی کو جدا شد ز شاه[۱] (ص ۱۲)
چیست عنقا؟ روپیه کبریت احمر؟ اشرفی	کیمیا؟ نوکر شدن یک هفته پیش بوالحسن
فقر و فاقه، عیله و عسرت، صبوری انتظار	آنچه باشد نوکران بادشه را در دکن[۲] (ص ۱۴)

آخری دو شعروں کے پس منظر میں اب "فلسفی" کے معنی بھی ملاحظہ فرمائیں:

فلسفی آن کس که می گوید خلا باشد محال	در خزانه گر رود هرگز نگوید این سخن[۳]

---

[۱] اللہ، اللہ اور رحمان (کے معنی) خدا ہے۔ شاید وہ بادشاہ کی فوج پر رحم کرے۔
جب جنت (کے معنی) بہشت اور آخرت (کا مطلب) وہ دنیا ہے تو یہ اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بادشاہ سے (مرکر) جدا ہوتا ہے [۲] عنقا کیا ہے؟ روپیہ اور کبریت احمر (سرخ بارود) ؟ اشرفی۔ کیمیا (کیا ہے) ؟ بوالحسن کے پاس ایک ہفتے نوکری کرنا۔ فقر و فاقہ، عیلہ و عسرت ہیں اور صبوری انتظار۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو بادشاہ کے نوکروں کو دکن میں حاصل ہیں۔ [۳] فلسفی وہ شخص ہے جو کہتا ہے کہ خلا محال ہے۔ اگر وہ (بادشاہ کے) خزانے میں جائے تو یہ بات ہرگز نہ کہے۔

قصیدۂ شہر آشوب میں عالمگیری لشکر کی زبوں حالی کا جو نقشہ کھینچا ہے، بظاہر بڑا عبرت انگیز نظر آتا ہے۔ گو اس میں صداقت ہے لیکن عالی کی مبالغہ طراز تخیل کی کرشمہ زائیوں نے اسے کچھ اس انداز سے پیش کیا ہے کہ صورت حالات یکسر مسخ ہو کر رہ گئی ہے جنگ کے دوران صعوبتیں اور سختیاں کس لشکر کو پیش نہیں آتیں؟ کیا محاصرے کے دوران ابوالحسن اور اس کے لشکر کو تباہی کا اندیشہ لاحق نہیں رہا ہوگا؟ مگر اس وقت تک عالی تو ابوالحسن، حیدرآباد اور حیدرآبادیوں کا ہمدرد اور بہی خواہ بھی تھا۔ اپنے عقیدے کے ہاتھوں تصویر کا ایک ہی رخ اور وہ بھی گہری رنگ آمیزی کے ساتھ دکھانے پر مجبور تھا۔

عالی کی ان ہرزہ سرائیوں کا حضرت اورنگ زیبؒ کو پورا علم تھا مگر وہ چشم پوشی اور اغماض سے کام لیتے ہوئے اپنی عالی ظرفی کا ثبوت دیتے رہے۔ اس کی تصدیق اس واقعے سے ہوتی ہے کہ گولکنڈہ کی تسخیر کے بعد ۱۰۹۹ھ میں وزیر اعظم جعفر خاں کے بیٹے کامگار خاں نے کہولت میں تانا شاہ کے معزول وزیر سید مظفر کی جواں سال بیٹی سے عقد کر لیا۔ اس موقعے پر عالی نے انتیس[۲۹] شعر کا ایک تند و ترش، فحش اور مبتذل قطعہ کہہ ڈالا۔ کامگار خاں نے عالمگیری بارگاہ میں فریاد کی۔ جواب میں حضرت اورنگ زیبؒ نے تحریر فرمایا:

خانہ زاد سادہ لوح می خواہد کہ ما را ہم در ین	سادہ مزاج خانہ زاد چاہتا ہے کہ ہمیں بھی اس رسوائی
رسوائی شریک سازد کہ او ہر چہ خواہد در باب	میں شریک کرے تا کہ وہ جو چاہے ہمارے بارے میں
ما بگوید و نویسد و شہرۂ عالم سازد، و پیشتر ہم	کہے اور لکھے اور دنیا میں مشہور کرے پہلے ہی ہمارے
در باب ما مقصر نبود۔ تلافی با اضافۂ انعام شد	باب میں کمی نہیں کی۔ اضافۂ انعام سے تلافی کی گئی

کہ دیگر ارتکاب نکند؛ باوجود این از خود کمی	کیونکہ وہ اسکا ارتکاب نہ کرے۔ اسکے باوجود از خود
نکرد۔ ہذبان بریدن و گردن زدن مقدور	کمی نہیں کی۔ زبان کاٹنا اور گردن مارنا ہمارے اختیار
نیست۔ باید سوخت و باید ساخت۔ رفیق	میں نہیں، لازم ہے کہ صبر و تحمل سے کام لیا جائے۔ وہ
لایرافقک ولایفارقک[1]	ایسا رفیق ہے جو نہ موافقت کرتا ہے نہ مفارقت۔

علی کے رویے میں تبدیلی | گولکنڈہ کی تسخیر (۱۰۹۸ھ) کے اختتام پر عالی نے حیدرآباد اور گولکنڈہ کے حالات اور وہاں کے باشندوں کی فطرت کا بچشم خود مشاہدہ کیا۔[2] اس وقت اسے علم ہوا ہوگا کہ اس ریاست کے استیصال اور اسے ممالک محروسہ میں شامل کرنے کا سبب وہ نہیں تھا جو عالمگیر کے دشمنوں نے مشہور کر رکھا تھا۔[3] حضرت اورنگ زیبؒ کو نہ توسیع مملکت کی ہوس تھی نہ اس شیعہ ریاست اور اس کے والی سے کوئی مخاصمت۔ سچ تو یہ ہے کہ خود ابوالحسن کی شامت اعمال اور ناعاقبت اندیشی اس کے زوال کا

---

[1] وقایع عالمگیر، چودھری نبی احمد سندیلوی، علی گڑھ ۱۳۴۸: ص ۵۔۴۔ [2] جنگ نامہ، نعمت خاں عالی، مطبع نولکشور ۱۹۰۰: ص ۷۔ [3] حیدرآباد اور گولکنڈہ کی تسخیر کے چند قابل ذکر اسباب یہ تھے: (۱) ابوالحسن نے مرہٹہ طاقتوں کے ساتھ ساز باز کر رکھی تھی اور مغلوں کو نقصان پہنچانے کے لیے انھیں مالی امداد دیتا تھا۔ (۲) سیرم پر، جو ممالک محروسہ میں شامل تھا، غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا اور اس کی واگزاری کے مطالبے کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا تھا کہ "سیرم بر سر نوک شمشیر و سنان نیزہ ہای ما دابستہ است" (منتخب اللباب جلد دوم: ص ۳۰۲) (۳) پیش کش کی ادائیگی موقوف کر دی تھی (۴) آکنا اور مادنا نامی دو برہمنوں کو، جو حقیقی بھائی تھے، ملک کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا تھا۔ ان "شدید التعصب" برہمنوں کے ظلم و ستم نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ (منتخب اللباب جلد دوم: ص ۳۰۲-۲۹۹) (۵) ابوالحسن کو صرف اپنی عیاشیوں سے سروکار تھا۔ اسے اتنا ہوش نہیں تھا کہ ریاست کے افسوسناک حالات پر توجہ دیتا۔ (۶) ریاست میں فسق و فجور کا عام رواج تھا۔ مسجدوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔

سبب بنی۔ غالباً گولکنڈہ اور حیدرآباد کے شرمناک حالات اور ابوالحسن اور اس کی رعیت کی عیش کوشیوں نے اس مہم کے سلسلے میں حضرت اورنگ زیبؒ کے موقف کی صداقت عالی پر واضح کر دی ہوگی اور اسے ابوالحسن، حیدرآباد اور حیدرآبادیوں سے، جن کی حمایت میں وہ اپنا زور قلم صرف کرتا رہا تھا، بدظن کر دیا ہوگا۔ اس خیال کی توثیق عالی کی تصانیف مابعد سے بھی ہوتی ہے جن کے نام یہ ہیں: دیوان (سال تدوین ۱۱۰۵ھ)، نعمت عظمی[1] (سال آغاز ۱۱۱۲ھ اور سال تکمیل ۱۱۱۵ھ)، جنگ نامہ (سال تالیف ۱۱۱۹ھ) اور بہادر شاہ نامہ (سال تکمیل ۱۱۲۱ھ) ان میں موخر الذکر دو کارنامے حضرت اورنگ زیبؒ کی وفات (۱۱۱۸ھ) کے بعد معرض وجود میں آئے ہیں۔ اس لیے ان میں حضرت اورنگ زیبؒ کی ستائش اور ابوالحسن، حیدرآباد اور حیدرآبادیوں کی مذمت کو عالی کے تملق یا کسی اور مصلحت پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ اول الذکر دو تصانیف میں مدح عالمگیر کی شمولیت پر ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کے گمان کی بے شک گنجائش ہے مگر خود عالی کی افتاد طبع اور حضرت اورنگ زیبؒ کا کردار اس کے بطلان کے لیے کافی ہے۔ جہاں تک عالی کا تعلق ہے وہ انتہائی بے باک اور صاف گو تھا۔ اس نے زندگی کے کسی دور میں تقیہ نہیں کیا۔ اس کی ہرزہ سرائیاں بادشاہ سے بھی پوشیدہ نہیں تھیں۔ اسے سزا دینا یا شاہی خدمت سے برخاست کرنا تو درکنار، حلیم، بردبار اور مردم شناس بادشاہ نے اسے تنبیہ تک نہیں کی۔ پھر کیا وجہ تھی کہ وہ بادشاہ کی ہجو سے اچانک دست کش ہو کر مدح سرائی کرنے لگا؟ اس کی دو ہی ممکنہ وجہیں ہو سکتی ہیں (۱) اس کی غلط فہمیوں کا ازالہ اور (۲) حضرت اورنگ زیبؒ کی سیرت جو گوناگوں

---

[1] قرآن کی تفسیر ہے جس کا مکمل نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں محفوظ ہے۔

خوبیوں سے مزین تھی۔ دونوں وجہوں کے واضح ثبوت خود عالی کی تحریروں میں موجود ہیں[1]۔ تسخیر گولکنڈہ کے بعد جب حقیقت حال اس کے مشاہدے میں آئی تو اس کا اظہار اس طرح کیا:

"زمانۂ قدیم کے مورخوں نے دکن کو بھی اور ہند کے باشندوں کو خس و خاشاک قرار دیا تھا۔ یہ بات بچشم خود مشاہدے میں آئی"[2]

"ہند" سے مراد شمالی ہند اور وسطی ہند کے صوبہ جات ہیں۔ دکن کا شمار اس وقت ممالک محروسہ میں کیا جاتا تھا۔ والی دکن ابوالحسن کی اسیری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"ابوالحسن حیدرآبادی اپنی نمک حرامی کی بنا پر اپنے ملازموں سمیت زمین و زمان کے فرماں روا کے دبدبے کی کمند میں اسیر ہوا اور عمر کے بقیہ مستعار لمحات ناکامی میں بسر کیے"[3]

اسی ضمن میں اہالیان دکن کی فطرت اور ان کے کردار کے بارے میں یوں خامہ فرسائی کرتا ہے:

"اس سبب سے کہ دکن کی سرزمین فتنہ و فساد کی کان ہے اور اس دیار کے باشندے زمانۂ قدیم سے بغاوت اور دشمنی کی راہ پر ہیں، نہ ان کے دل میں وفا ہے نہ باطن میں صفا۔ اس ملک کے رئیسوں کی ایک جماعت نے عطائے منصب کے باوجود بندگی کی راہ سے انحراف کیا اور سنتا (گھورپڑے) کے مفسدہ پرداز بھائی راما سے مل کر سرکشی کی"[4]

---

[1] چونکہ مضمون کی تنگ دامانی اجازت نہیں دیتی اس لیے صرف اردو ترجموں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔
[2] جنگ نامہ، مطبع نولکشور ۱۹۰۸ء: ص ۷ [3] ایضاً [4] ایضاً

بہادر شاہ کی فتح دکن کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتا ہے:

"یہ وہی ملک دکن سراسر مفاسد و فتن ہے جس کے انتظام پر حضرت خلد مکان ثانی اثنین و ذوالقرنین (اورنگ زیبؒ) نے ایک پورا قرن[1] صرف فرمایا تھا اور تمام اعیان دولت و ارکان سلطنت کو اس کے نظم و ضبط کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس کے باوجود آئینۂ سکندری زنگ آلود ہو گیا تھا اور اس میں صورت حال مقصد و مراد کے برعکس دکھائی دے رہی تھی"[2]

یہ سارے بیانات عالی کے شخصی تجربات اور عینی مشاہدات پر مبنی اور حضرت اورنگ زیبؒ کے تعلق سے اس کی مذموم اور گستاخانہ روش کے اقبال و اعتراف کے مترادف ہیں۔ ان میں اسی ابوالحسن کو "نمک حرام"، اسی حیدرآباد کو "فتنہ و فساد کی کان" اور اسی دیار کے باشندوں کو "زمانۂ قدیم سے بغاوت اور دشمنی کی راہ" پر گامزن اور ان کے دلوں کو وفا اور صفا سے خالی کہا گیا ہے جن کی حمایت میں عالی حضرت اورنگ زیبؒ کی شان میں گستاخی کا مرتکب ہوا۔ شاید اسی ناقابل تلافی ادبی گناہ کی پاداش میں وہ آج ایک ہجو نگار کی حیثیت سے مشہور ہے اور یہ شہرت اس جیسے باکمال شاعر اور صاحب طرز نثر نگار کے لیے مایۂ فخر و مباہات ہرگز نہیں ہو سکتی۔

مدح اورنگ زیبؒ

۱۱۰۰ھ کے حدود میں عالی پر گولکنڈہ کی مہم کے حقیقی اسباب روز روشن کی طرح عیاں ہوئے۔ جب اس کی نگاہوں پر پڑا ہوا عصبیت اور جانب داری کا پردہ اٹھا تو اسے حضرت اورنگ زیبؒ کے "شیم" میں "اخلاق نبیؐ" کے جلوے نظر آنے لگے اور وہ حضرت "حسانؓ" (بن ثابت) کی شاگردی میں ان کا "مداح" بن گیا۔ یوں تو

---

[1] سو[۱۰۰]، اسی[۸۰] یا تینتیس[۳۳] برس کی مدت۔ یہاں تینتیس[۳۳] برس کی مدت مراد ہے [2] بہادر شاہ نامہ، مخطوطہ (برٹش میوزیم، لندن۔ مائکروفلم)؛ ورق ۲۱۵ الف و ۲۱۵ ب۔

اس نے فتوحاتِ دکن پر متعدد قطعاتِ تاریخ عالمگیری بارگاہ میں پیش کیے جن میں مدح کے پہلو پائے جاتے ہیں۔ "مثلاً شاہ عالمگیر غازی بادشاہ دین پناہ"[1] — مالک الملک جہان[2] وغیرہ لیکن ان کی حیثیت قطعی رسمی ہے۔ ۱۱۰۰ھ یا ۱۱۰۱ھ میں وہ بادشاہ سے رخصت لے کر دہلی چلا گیا۔ ۱۱۰۴ھ میں بادشاہ نے اسے "نعمت خاں" کا خطاب عطا فرمایا اور ایک خلعت خاص بھی روانہ فرمائی۔ غالباً اس خلعت کے ساتھ اس کی طلبی کا پروانہ بھی رہا ہو گا کیونکہ خلعت یابی کے شکریے کے بطور اس نے ایک قصیدہ بعنوان:

"در شکر خلعت خاص کہ حضرت پادشاہ عالمگیر خلد اللہ ملکہ از دکن مرحمت فرمودہ فرستادند"

لکھا جس کے مطلع کے آہنگ میں صدائے لبیک کی سی گونج صاف سنائی دیتی ہے:

شاہا نظر بروی تو کردن عبادتست　　　مژگان بہم زدن چو نماز جماعتست[3]

چنانچہ اپنے بادشاہ کے دیدار سے عبادت کا ثواب پانے کی تمنا لیے ہوئے وہ دہلی سے دکن روانہ ہوا۔ اس وقت عالمگیری لشکر اسلام پوری (بیرم پوری) میں فروکش تھا۔ بادشاہ نے اسے منصب بکاولی پر مامور کیا۔ عالی نے کھلے دل سے اپنے جذبات تشکر و امتنان کا اظہار اور بادشاہ کی نوازشوں ۔۔۔۔ کا اعتراف کئی جگہ کیا ہے۔ ایک قطعے میں کہتا ہے:

چوں دلی نعمت ز روی مرحمت نام مرا　　　در شمار بندگان خویش نعمت خان نوشت

---

[1] دیوان نعمت خاں عالی، مطبع نولکشور: ص ۲۲۹ [2] ایضاً [3] یہ قصیدہ مطبوعہ دیوان میں شامل نہیں۔

بندہ را می باید از عجز و نیاز و مسکنت　　　شکر این نعمت بقدر وسعت امکان نوشت

پادشاہا دین پناہا بسکہ کردی عاطفت　　　عہد کرد این خانہ زاد و خویش را قربان نوشت

لطف تو بیش از شمار است ای خداوند جہان　　　تا کجا بتوان شمرد و تا کجا بتوان نوشت[1]

ایک رباعی میں جذبۂ شکر گزاری سے سرشار ہو کر "شکر نعمت بصد زبان" یوں ادا کرتا ہے:

راضی شدم از تو ز دل و ز جان من　　　ممنون گشتم ز شفقت و احسان من

شکر نعمت بصد زبان می گویم　　　پس نعمت خاں توئی و شاکر خان من[2]

۱۱۰۵ھ میں عالی نے اپنا دیوان "حسب الحکم شہنشاہ" ترتیب دیا۔ اس کے دیباچے میں (جو مطبوعہ نسخوں میں شامل نہیں) دو جگہ حضرت اورنگ زیب کا ذکر کمال عقیدت و احترام کے ساتھ کیا ہے۔ ایک جگہ ستائشی کلمات کے بعد یہ قطعہ نقل کیا ہے:

مالک الملک جہان صاحبقران روزگار　　　شاہ عالمگیر غازی پادشاہِ دین پناہ

دست قدرت ز آستین او بر آوردہ خدای　　　ورنہ شاہان را کجا این قدرت و این دستگاہ

دراز ای آن کہ شد بر جبہہ سیمای سجود　　　فضل حق کرد آستانش را سلاطین سجدہ گاہ

کس چہ گوید، در مدیح او نبیؐ فرمودہ است　　　پادشاہ عادل آمد بر زمین ظل الہ[3]

یہ مدحیہ قطعہ دیوان کی تدوین کے دوران (غالباً ۱۱۰۵ھ) میں لکھا گیا ہے کیونکہ یہ دیباچے کا جزو ہے اور دیوان میں شامل نہیں۔ اس کا ہر شعر عالی کے حسن عقیدت

---

[1] دیوان عالی، مطبع نولکشور: ص ۲۳۰ [2] ایضاً: ص ۲۴۲ [3] دیوان نعمت خاں عالی موسوم بہ خوان نعمت، مخطوطہ، سالار جنگ میوزیم حیدرآباد: ورق ۱۰ ب۔

کا مظہر ہے۔ ان پر بے جا خوشامد و تملق کا شبہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ۱۱۰۰ھ کے بعد عالی کی کسی تحریر میں کوئی ایسا لفظ ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا جس سے حضرت اورنگ زیبؒ کی ہجو کا پہلو نکلتا ہو۔ (صرف "جنگ نامہ" میں ایک جملہ موجود ہے جو دراصل محمد معظم کے صلح کے پیغام کے جواب میں محمد اعظم نے اپنے خط میں تحریر کیا تھا۔[1] چونکہ اسے نظر انداز کرنا مورخانہ دیانت داری کے منافی ہوتا، اس لیے عالی اسے نقل کرنے پر مجبور تھا۔) اس کے برعکس ۱۱۰۰ھ کے بعد کی اپنی تمام نگارشاتِ نظم و نثر میں عالی نے حضرت اورنگ زیبؒ کی تعظیم و تکریم کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے۔ مرورِ ایام کے ساتھ بادشاہ سے اس کی عقیدت بڑھتی گئی۔ چنانچہ ۱۱۰۰ھ کے بعد کی فتوحات پر اس نے جو قطعات تاریخ کہے ہیں ان میں بیان واقعہ کے ساتھ مدح کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ مثلاً سنتا گھورپڑے کی سربریدگی[2] (۱۱۰۸ھ) پر اس کا قطعۂ تاریخ ملاحظہ ہو:

پادشاہ دین امیر المومنین　　شاہ عالمگیر غازی زندہ باد

قوت اسلام از شمشیر اوست　　کفر در عہدش ز عالم بر فتاد

چون سر سنتا رسیدای دل بگو　　شہ سر کافر برید ہ از جہاد[3]

یہ پہلا موقع ہے کہ عالی نے حضرت اورنگ زیبؒ کو "امیر المومنین" کہنے کی

---

[1] وہ جملہ یہ ہے: "اگر تقدیر سر رشتہ این امر خطیر بقسمت باز بستی، ہیچ پسر بحضور پدر تخت نہ نشستی۔" (جنگنامہ: ص ۸) [2] اس واقعے کی تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں راقم کا مضمون "اورنگ زیبؒ کی زندگی کے اہم واقعات کی تاریخیں"، معارف اپریل ۱۹۸۹: ص ۲۸۳-۲۸۶ [3] دیوان عالی مطبع نولکشور: ص ۲۳۸۔

جسارت کی ہے۔ اسے محض سخن گسترانہ بات کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اپنی تفسیر قرآن موسوم بہ نعمت عظمیٰ (سال آغاز ۱۱۱۲ھ و سال تکمیل ۱۱۱۵ھ) کا حضرت اورنگ زیبؒ سے انتساب کرتے ہوئے اس کے دیباچے میں انھیں "امام المسلمین امیر المومنین" کے القاب سے یاد کیا ہے۔ بہادر شاہ نامہ میں ان کی وفات کا حال بیان کرتے ہوئے جو رباعیاں شامل کی ہیں[1] وہ بھی اس کے جذبات غم کی مظہر اور احساسات درد کی آئینہ دار ہیں۔

اب تک متفرق مثالوں کے حوالے سے عالی کے ذہنی رویے میں رونما ہونے والے انقلابات کا جائزہ لیا جاتا رہا۔ اب وہ قصیدہ بتمام و کمال نقل کیا جاتا ہے جو عطائے خلعت پر اظہار تشکر کی غرض سے عالی نے کہا ہے۔ یہ ۱۱۰۴ھ کا واقعہ ہے جب عالی حضرت اورنگ زیبؒ کا پوری طرح مرید ہو چکا تھا۔ اپنے ولی نعمت کی شان میں اس کی گل افشانی گفتار کا عالم ملاحظہ فرمائیں:

شاہا! نظر بروی تو کردن عبادتست　　مژگان بہم زدن چو نماز جماعتست

اخلاق حق نمود وجود مقدسست　　این سایہ را بذات کمال شباہتست

ہستند پایمال تو شاہان روزگار　　یعنی کہ خاک پای تو اکسیر دولتست

سیر اند جملہ خلق ز الوان نعمتت　　چرخ فلک نلاخن سنگ مجاعتست

کامل شود ز فیض ترقی چو ماہ نو　　ہر کس کہ سرفراز رکاب سعادتست

کوہی کہ کان زر بود اکنون بعہد تو　　پاسنگ بہر کفۂ میزان ہمتست

---

[1] بہادر شاہ نامہ، مخطوطہ نمبر OR 24، برٹش میوزیم لندن (مائکروفلم)، ورق ۲۱ ب تا ۲۲ الف۔ نیز ملاحظہ فرمائیں راقم کا مضمون معارف، اپریل ۱۹۸۹ء: ص ۳۰۰-۳۰۱

یک صفحہ از کتاب سخاوت نوشتہ بحر — خط است موج و نقطہ حباب این چہ صنعتست
سطری فتادہ است ز کیفیت بدست دہر — از خط و خال شیر بمشق شجاعتست
پیوستہ چون سپہر شوی در رکوع خم — شد زین کمان عیان کہ خدا را چہ قوتست
اقلیم دین مسخر ازین قامت دوتا — از طاعتست اینکہ جہاں در اطاعتست
دایم ز سجدہ سکہ بروی زمین زنی — این خاتم خداست کہ در دست قدرتست
ہرجا پی جہاد شدی، فتح رو نمود — نعل سمند مصقل مرآت نصرتست
در عرصۂ غزا علم از بس بلند شد — آنجا ہلال ناخنی از شیر رایتست
وان پنجہ یی کہ بر زبر طوق نصب شد — بہر چراغ فتح تو دست حمایتست
ہر یک ز خلق از کرم و حلم و عدل تو — شکر خدا کہ در کنف امن و راحتست
ہر دو جہان تراست مسلم زہی کمال — کو خسرو دگر کہ شہ ملک و ملتست
ہر سہ صفت کہ خوب ترین فضایل است — در تست و آن شجاعت و جود است عفتست
ہر چار مذہب از تو درین عہد استوار — ہمچون چہار پایۂ تخت خلافتست[1]
ہر پنج شب اذان شود از درگہت بلند — بہر شکوہ دین مبین پنج نوبتست
ہر شش جہت چنانکہ ز خورشید روشن است — در عصر تو ز پرتو مہر عدالتست
ہر ہفت کشور از تو مسخر شدہ بہ تیغ — ذات تو آفتاب سپہر خلافتست
ہر ہشت جنت از تو شود پر ز مومنان — جدت ز بسکہ صرف رواج شریعتست
ہر نہ فلک بجہد سرت گرد از نیاز — قدر تو برتر از ہمہ در شان و شوکتست

[1] یہاں خلافت کے بجائے حکومت کا قافیہ تخت کی مناسبت سے زیادہ مناسب ہوتا مگر عالی نے حکومت پر خلافت کو ترجیح دے کر بڑی معنی خیز اور غور طلب بات کہی ہے۔

ہر دہ خرد اگر ز تو گیرد سبق رواست — در مکتبی کہ درس ز تدبیر و حکمتست
وین طرفہ تر کہ با ہمگی شغل سلطنت — درویشی و شعار تو فقر و ریاضتست
امروز چون تو کامل صاحب مقام کو — اغلب مدار کار تو بر خرق عادتست
خواہم چو نقش پای، سراپا جبین شوم — بر درگہت کہ قبلۂ ارباب حاجتست
شادم چو گل کہ وا شدن غنچۂ دلم — وابستۂ نسیم بہار عنایتست
بادا دراز! رشتۂ عمر عزیز تو — شیرازہ از برای کتاب شریعتست
تو حافظ کلام و خدا حافظ تو باد — ذات تو نیز داخل آیات رحمتست
عالی سفید بخت شد از لطف پادشاہ — پروردۂ نمک ز ہمین خوان نعمتست

گر در ادای شکر سراپا زبان شود
کی فارغ از بیان ہمین شکر خلعتست[1]

اس میں شک نہیں کہ اس قصیدے کے ابتدائی اشعار کو رسمی مداحی پر محمول کیا جا سکتا ہے لیکن بعد میں عالی نے حضرت اورنگ زیبؒ کے جن اوصاف کو بیان کیا ہے وہ ان کی ذات میں بدرجۂ اتم موجود تھے۔ انھیں مبالغے سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ مخلوق کا حضرت اورنگ زیبؒ کے لطف و کرم اور حلم و عدل کے زیر سایہ امن و راحت میں زندگی بسر کرنا، حضرت عالمگیرؒ کا ہر دو جہاں کا مسخر کرنا (فقیری میں امیری کرنا)، ان کی ذات میں شجاعت، جود اور عفت جیسے فضائل کا پایا جانا، ایمۂ اربعہ کے پیروؤں کے عقاید کا پاس و لحاظ رکھنا، پانچ وقت

[1] دیوان نعمت خاں عالی موسوم بہ خوان نعمت، مخطوطہ نمبر ۲۱۷، سالار جنگ میوزیم حیدرآباد ورق ۱۶۷ الف تا ۱۶۸ الف (قصیدے کا آخری شعر حذف کر دیا ہے)

ان کی درگاہ سے صدائے اذان کا بلند ہونا، ان کے مہر عدالت کا شش جہت میں انصاف کی روشنی بکھیرنا، انکے فیض تربیت سے مسلمانوں کے عقاید و عمل کی اصلاح ہونا اور اس کے نتیجے میں جنت کا مومنوں سے پر ہونا وغیرہ ایسے مضامین ہیں جنھیں عالؔی کے تخیل کی کرشمہ سازی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ سارے اوصاف حضرت اورنگ زیبؒ کی شخصیت کے اجزائے لاینفک رہے ہیں۔ ان کی صداقت پر خود عالؔی کا بھی اصرار ہے۔ نعمت عظمیٰ کے دیباچے میں منقولہ بالا قصیدہ نقل کرنے سے پہلے لکھتا ہے:

"الحمد للہ تعالیٰ و تقدس کہ سرسبزی و خورمی شجرۂ اسلام
کہ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ[1] صفت آن
است دریں عہد مبارک بکوشش پادشاہ دین پرور
عدل گستر، فرمانروای ہفت کشور المظفر والمنصور
فی المغازی امام المسلمین امیر المومنین حضرت محی الدین
محمد اورنگ زیب عالمگیر پادشاہ غازی بمرتبۂ کمال است
و محفوظ از خزان اختلال۔ آبداری تیغ کافر کشش
در جہاد) بآبیاری دوحۂ اسلام دریا موج است و تربیت
فیض آفتاب خاصیتش از دہش و داد در رسانیدن
ثمرۃ المراد مسلمانان بر اعلیٰ مرتبۂ اوج۔ گویی کہ اَشِدَّآءُ
عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ[2] در شان عظمت نشان

خدائے پاک و برتر کا احسان کہ شجرۂ اسلام کی سرسبزی اور تازگی
کہ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ جس کی صفت ہے
اس مبارک عہد میں دین پرور، عدل گستر بادشاہ ہفت
کشور کے فرمانروا، غزوات میں فتح و نصرت پانے والے
مسلمانوں کے امام مومنوں کے خلیفہ حضرت محی الدین محمد اورنگ
زیب عالمگیر بادشاہ غازی کی کوشش سے درجۂ کمال پر ہے
اور خزاں کے آسیب سے محفوظ ہے۔ انکی کافر کش تلوار کی
آبداری جہاد میں اسلام کے درخت کی آبیاری میں دریائے موج
ہے اور انکے آفتاب کی خاصیت رکھنے والے فیضان کی
تربیت داد و دہش کے ذریعے مسلمانوں کا ثمرۂ مراد ان
تک پہنچانے میں بلندی کے اعلیٰ مرتبے پر۔ گویا (آیت) اَشِدَّآءُ

[1] جسکی جڑیں خوب گڑی ہوں اور شاخیں آسمان پر جا رہی ہوں۔ (قرآن مجید، سورہ نمبر ۱۴ آیت نمبر ۲۴)

[2] وہ کافروں کے مقابلے میں تیز ہیں اور آپس میں مہربان ہیں (ایضاً، سورہ نمبر ۴۸ آیت نمبر ۲۹)

نازل است، و جد و جہدش در ادای فرایض و سنن
بشابہی کہ از بیداری بخت خواب را بخواب ہم بیند
بیداری کہ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ[1] بیان
احوال عبادت اشتمالش را شامل۔ فدوی جان نثار
یعنی این بندۂ خاکسار اگرچہ بالقوہ تقریر و تحریر لائق
احاطۂ فضایل و محامدش عاجز و قاصر دیدہ لیکن
بمقتضای مَا لَا يُدْرَكُ كُلُّهٗ لَا يُتْرَكُ كُلُّهٗ[2] بقدر
طاقت بیان و استطاعت زبان رقم داشتہ تحصیل حسنہ و
قصد ثواب کشیدہ و چشم از استغراق شاعرانہ و
مبالغۂ مداحانہ پوشیدہ، نہ سخنی زاید از وقوف و
نہ وصفی مجعول و مصنوع[3]

عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ انہی کی شان عظمت نشان میں
نازل ہوئی ہے اور فرایض و سنن ادا کرنے میں انکی جد و جہد
ایسی ہے کہ بیدار بختی سے نیند کو خواب میں بھی نہیں دیکھتے۔
بانو (آیت) تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ ان کے
عبادات سے پر احوال میں شامل ہے۔ فدوی جاں نثار
یعنی یہ بندۂ خاکسار اپنی تقریر و تحریر کی طاقت کے لحاظ سے
ان کے فضایل و محامد کا احاطہ کرنے میں اپنے آپ کو عاجز
اور قاصر پاتا ہے لیکن مَا لَا يُدْرَكُ كُلُّهٗ لَا يُتْرَكُ كُلُّهٗ
کے مصداق اپنے زور بیان اور قوت زبان کے بقدر تحریر کر کے
نیکی کے حصول اور ثواب کا قصد کیا ہے اور شاعرانہ اغراق
اور مداحانہ مبالغے سے چشم پوشی کی ہے۔ نہ کوئی بات اپنی
واقفیت سے زیادہ نہ کوئی وصف ذہن کی پیداوار غیر حقیقی۔

عالؔی کی صاف گوئی اور بے باکی کے پیش نظر اس کے قول بالا کی صداقت شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ اس کا ہر لفظ حضرت اورنگ زیبؒ سے اس کی عقیدت و ارادت کی داستان سناتا ہے۔ فاضل اجل و عالم بے بدل حضرت مولانا ابوالحسن ندوی اپنے مضمون "جنرل محمد ضیاء الحق شہید" میں فرماتے ہیں کہ دور حاضر کے معروف و ممتاز یمنی عالم اور ادیب

[1] انکے پہلو خوابگاہوں سے علاحدہ ہوتے ہیں۔ (قرآن مجید، سورہ نمبر ۳۲ آیت نمبر ۱۶) [2] اگر سارا نہ ملے تو سارے کو چھوڑنا بھی نہیں چاہیے۔ (عربی ضرب المثل) [3] نعمت عظمیٰ، حصہ اول، مخطوطہ نمبر P.337، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ (مائکرو فلم)، ورق ۴ الف ۔ ۴ ب

شیخ علی طنطاوی نے حضرت اورنگ زیبؒ کو "خامس الخلفاء الراشدین" قرار دیا ہے[1]
مگر عالی نے تو تشیع میں غلو کے باوجود آج سے تین سو سال پہلے انہیں "امیر المومنین"
اور ان کی حکومت کو "خلافت" کہنے کی جسارت کی ہے۔ اس نے حضرت اورنگ زیبؒ
کی مدح میں ایک غزل بھی کہی ہے۔ اس کے مقطعے میں ان کی مداحی کا جو سبب بیان کیا ہے
اس پر بھی اس کے قصیدے اور بیان مزبور کے پس منظر میں غور فرمائیں۔ کہتا ہے[2]:

سر ہای سلاطین ہمہ خاکِ قدم تست — اسکندر عہدی و دولت جام جم تست

تمثیل سلیمانؑ شدہ بی غیر نبوت — یعنی کہ چو او زہد و جلال و حشم تست

می داد خدا جان بجسد از دم عیسیٰؑ — از فضل خدا آن اثر اکنون بدم تست

چون بارش رحمت کہ کند زندہ جہان را — عالم ہگی چشم براہِ کرم تست

آن چشمۂ فیضی کہ در ان آب حیات است — کز بر ہمہ روشن کہ دوات قلم تست (کذا)

از کلکِ قضا باید قدرت رقم فتح — منقوش بخط ازلی بر علم تست

خورشید و قمر بہر سپہر است دو دیدہ — وان ہر دو پُر از نور شبیہِ درم تست

عالی شدہ مداح ز شاگردی حسانؓ
چون دید کہ اخلاق نبیؐ در شیم تست

یہ غزل دیوان نعمت خاں عالی موسوم بہ "خوان نعمت" میں بھی شامل ہے جسکی تدوین
"حسب الحکم بادشاہ" خود عالی کے ہاتھوں ۱۱۰۵ھ میں عمل میں آئی۔ اخلاص و عقیدت کے
جذبات سے مملو یہ غزل دیوان کی تدوین سے پہلے (اور غالباً ۱۱۰۰ھ کے بعد) یا تدوین دیوان
کے دوران کہی گئی ہوگی۔ (۱۱۰۰ھ سے پہلے تو اسکی ہجو گوئی کا دور تھا۔) اسے عالی کیجانب سے حضرت
اورنگ زیبؒ کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت اور انکی شان میں اس سے سرزد ہونے والی گستاخیوں کے
کفارے سے تعبیر کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

[1] ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ، ستمبر ۱۹۸۰ء: ص ۲۰ [2] دیوان نعمت خان عالی، مطبع نولکشور: ص ۴۹-۵۰

تاریخ التراث العربی

فواد محمد سیزگین کا اہم کارنامہ

از

جناب شیخ نذیر حسین، مدیر اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔

مسلمانوں کے علما اور فضلا نے ہر دور میں علوم و فنون کی اقسام اور ان کی تاریخ پر
کتابیں لکھی ہیں، ان میں اولیت کا شرف یعقوب بن اسحاق کندی (م ۲۶۰ھ/۸۷۳ء)
اور ابو زید سہل بلخی (م ۳۲۲ھ/۹۳۴ء) کو حاصل ہے، جنھوں نے سب سے پہلے
علی الترتیب "کتاب فی اقسام العلم الانسی"، "کتاب فی ماہیۃ العلم واصافہ" اور "کتاب
فی اقسام العلوم" لکھیں۔ بد قسمتی سے یہ کتابیں آج کل ناپید ہیں۔ ان کے علاوہ کتابوں
میں اس موضوع پر مندرجۂ ذیل مصنفوں کی تصانیف کے نام بھی ملتے ہیں:

۱۔ الفارابی (م ۳۳۹ھ/۹۵۰ء) = احصاء العلوم،

۲۔ محمد بن احمد بن یوسف خوارزمی (م ۳۸۷ھ) = مفاتیح العلوم،

۳۔ رسائل اخوان الصفاء و خلان الوفا (چوتھی صدی ہجری)،

۴۔ ابن فریغون (م چوتھی صدی ہجری) = جوامع العلوم،

۵۔ ابن الندیم (تالیف ۳۷۷ھ) = الفہرست،

۶ - ابن سینا (م ۴۲۸ھ/۱۰۳۷ء) = اقسام العلوم العقلیہ،

۷ - محمد بن خیر اشبیلی (م ۵۷۵ھ) = فہرست ما رواہ عن شیوخہ،

۸ - امام فخر الدین رازی (م ۶۰۶ھ/۱۲۱۰ء) حدائق الانوار فی حقائق الاسرار،

اس کے بعد دائرۃ المعارف کی طرز پر کتابیں لکھی جانے لگیں، مثلاً:

۱ - النویری (م ۷۳۳ھ/۱۳۳۳ء) = نہایۃ الارب فی فنون الادب،

۲ - القلقشندی (م ۸۲۱ھ/۱۴۱۸ء) = صبح الاعشیٰ فی صناعۃ الانشاء۔

متاخرین میں مندرجۂ ذیل علما نے اس موضوع پر کتابیں لکھی ہیں:

۱ - طاش کبریٰ زادہ (م ۹۶۸ھ/۱۵۶۱ء) = مفتاح السعادۃ و مصباح السیادۃ،

۲ - حاجی خلیفہ (م ۱۰۶۷ھ/۱۶۵۷ء) کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون،

۳ - محمد اعلیٰ تھانوی (م بارھویں صدی ہجری) = کشاف مصطلحات الفنون،

۴ - (نواب) محمد صدیق حسن خان (م ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء) = ابجد العلوم۔

متاخرین کی تصانیف میں ممتاز ترین کتاب کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون ہے، جسے فلوگل نے ۱۸۳۵ - ۱۸۵۸ء میں لائپزگ (جرمنی) سے سات ضخیم جلدوں میں لاطینی ترجمہ کے ساتھ شایع کیا۔ اس کتاب کے دو ایڈیشن استانبول سے بھی شایع ہو چکے ہیں۔ اس میں ابجدی اعتبار سے مختلف علوم و فنون کی کتابوں کے نام مذکور ہیں اور یہ کتاب علمی کام کرنے والوں کے لیے بیش بہا تحفہ ہے۔

علوم و فنون کی تاریخ کی تدوین کے علاوہ مسلمانوں کا مایہ ناز علمی کارنامہ تاریخ نویسی اور تذکرہ نگاری ہے۔ مغربی یورپ اور برطانیہ کی عام اور مسلسل سیاسی تاریخ پندرہویں، سولھویں صدی سے شروع ہوتی ہے جبکہ روس کی مستند تاریخ کا آغاز

ستر ہویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلامی تاریخ میں پہلی صدی ہجری سے لے کر زوال بغداد کے بعد تک کے سنہ وار واقعات اور مشاہیر کے حالات ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ سیرت پاکؐ، صحابۂ کرامؓ اور تابعین عظام کے سوانح میں سینکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں، قرآن مجید کی ضخیم تفسیریں، کتب حدیث کی بے شمار شرحیں اور فقہ کے بھاری بھرکم دفاتر ان کے علاوہ ہیں۔ قاریوں، مفسروں، محدثوں، حدیث کے راویوں، فقیہوں، نحویوں، لغویوں، ادیبوں، شاعروں، منطقیوں، فلسفیوں، سائنس دانوں، طبیبوں، بیطاروں، صوفیوں، قاضیوں، نور بصیرت سے محروم عالموں، امیروں، وزیروں، شہزادوں، تاجروں، عاشقوں، منجموں، موسیقاروں، عقلمندوں اور احمقوں کے علاوہ راہب خانوں اور قلعوں کے حالات میں مستقل کتابیں موجود ہیں۔ بعض بڑے شہروں کی تاریخ کئی کئی جلدوں پر مشتمل ہے، مثلاً خطیب بغدادی کی شہرہ عالم تاریخ، تاریخ بغداد اور حافظ ابن عساکر کی تاریخ مدینہ دمشق[1]۔ ان کے سوا بعض علمی مراکز، مثلاً قاہرہ، قیروان، فاس، اصفہان، نیشاپور، جرجان اور قزوین کی بھی تاریخیں ہیں، جن میں وارد علماء کے دلچسپ حالات ملتے ہیں۔ مقری کی نفح الطیب مشرق سے اندلس جانے والے ارباب علم کے حالات کا سب سے بڑا ماخذ ہے۔ جغرافیہ اور سیاحت کی کتابیں ان سے الگ ہیں بقول مولوی عبدالعزیز میمن مرحوم صرف استانبول کے کتاب خانوں میں ہزاروں قلمی کتابیں طباعت و اشاعت سے محروم چلی آرہی ہیں، جو مسلمانوں کا قیمتی علمی سرمایہ ہیں۔

---

[1] تاریخ مدینہ دمشق کی چالیس جلدیں مجمع اللغۃ، دمشق کی جانب سے شایع ہو چکی ہیں اور ہنوز طباعت جاری ہے۔

مذکورہ بالا کتابوں کے مصنفوں کے عہد بعہد حالات اور ان کے نتائج علمی کو نئے
مذاق اور علمی تاریخ کے جدید معیار کے مطابق زمانی اعتبار سے مرتب کرنا نہایت مشکل
کام تھا۔ سب سے پہلے اس کام پر جرمن مستشرقوں نے توجہ کی۔ ان میں فان ہامر
پرگشتال اور کارل بروکلمان کے نام سرفہرست ہیں۔ بروکلمان نے اپنی شہرۂ آفاق
"تاریخ ادبیات عربی" کی جمع و ترتیب اور تصنیف میں اپنی عمر گرانمایہ کے چالیس برس
صرف کردیئے۔ فاضل مصنف کی وسعت معلومات، شوق اور محنت کی داد نہ دینا
ظلم ہوگا۔ یہ تاریخ مع اپنے ضمیموں کے پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی پہلی جلد
۱۹۰۱ء میں اور تیسرا ضخیم ضمیمہ یا تکملہ ۱۹۴۲ء میں شایع ہوا۔ کتاب کے بعض اجزاء کا
عربی ترجمہ دارالمعارف، قاہرہ کے اہتمام میں شایع ہوچکا ہے۔

بروکلمان کی کتاب چھپنے کے بعد گذشتہ تیس برسوں میں بہت سے نئے
مخطوطات دریافت ہوچکے ہیں اور بے شمار قلمی مسودات چھپ کر شایع ہوچکے ہیں۔
علمی حلقوں میں ایک عرصے سے یہ ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ بروکلمان کی کتاب
پر نئی معلومات اور جدید مطالعہ و تحقیق کی روشنی میں نظر ثانی کی جائے۔ خوشی کی بات
ہے کہ یہ عظیم الشان کام ایک ترک فاضل فواد محمد سیزگین (FUAT SEZGIN)
نے کر دکھایا ہے۔ سیزگین صاحب خود ترکیہ کے باشندے ہیں جن کی تعلیم و تربیت جرمن
یونیورسٹیوں میں ہوئی ہے۔ موصوف کو علم حدیث سے بڑا لگاؤ ہے، چنانچہ انھوں نے
سب سے پہلے صحیح بخاری کے ماخذ پر ایک کتاب جرمن زبان میں لکھ کر ڈاکٹریٹ کی۔

موصوف کا دوسرا علمی کارنامہ ابوعبیدہ معمر بن مثنیٰ (م ۲۱۰ھ) کی کتاب
مجاز القرآن کی تحقیق، تصحیح اور تعلیق کے ساتھ اشاعت ہے (قاہرہ ۱۹۵۴ء)۔ اسلام کی

پہلی تین صدیوں میں مجاز القرآن، معانی القرآن اور غریب القرآن مترادف اور
مشترک الفاظ کے طور پر مستعمل رہے ہیں۔ ابوعبیدہ سب سے پہلے قرآن مجید کے مشکل
الفاظ کے معنی لکھتے ہیں اور ان کی تائید میں کلام عرب سے استشہاد لاتے ہیں۔ یہ وہی
ابوعبیدہ ہیں جن کا امام بخاریؒ اپنی صحیح کی کتاب التفسیر میں بار بار حوالہ دیتے ہیں۔
امام بخاریؒ کے علاوہ مجاز القرآن سے اخذ و استفادہ کرنے والوں میں ابن قتیبہ
(م ۲۷۶ھ)، الطبری (م ۳۱۰ھ)، الزجاج (م ۳۱۱ھ)، جوہری (۳۹۱ھ) اور
متاخرین میں حافظ ابن حجر عسقلانی، شارح صحیح البخاری کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

سیزگین صاحب کا تیسرا اہم اور زندہ جاوید کارنامہ بروکلمان کی تاریخ
ادبیات عربی کی نئی اور نظر ثانی شدہ اشاعت ہے جس کا نام GESCHICHTE-DES-
ARABISCHEN-SCHRIFTUMS (تاریخ التراث العربی) ہے اور جو لائیڈن
سے آٹھ ضخیم جلدوں میں شایع ہوئی ہے (۱۹۶۷ء تا ۱۹۸۲ء) کتاب کے مواد کی جمع اور
ترتیب میں فاضل مصنف نے پندرہ برس صرف کیے ہیں، مخطوطات کی نقلیں
حاصل کرنے کے لیے انھوں نے یورپ کے علاوہ مشرق وسطیٰ، شمالی افریقہ اور
ہندوستان تک کا سفر کیا ہے اور علمی رسائل سے مضامین کی نقلیں حاصل کرنے
کے لیے زرکثیر صرف کیا ہے۔ عربی مخطوطات کا جتنا وافر ذخیرہ ترکیہ کے کتاب خانوں
میں ہے، وہ کسی دوسرے ملک میں نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ سیزگین صاحب خود ترک
ہیں اور انھیں ترکیہ کے خزائن مخطوطات میں آسانی سے رسائی حاصل ہے۔ مزید
برآں ان کے اساتذہ میں پروفیسر ریٹر (RITTER) اور ریشر (RESCHER)
جیسے ارباب علم شامل ہیں، جن کی عمریں استانبول (قسطنطنیہ) کے کتاب خانوں میں

عربی کی قلمی کتابوں کی تلاش و دریافت اور تحقیق میں گذری ہیں۔ ان جرمن فضلانے ترتیب و تنسیق میں مصنف کی مدد کی ہے۔ اس لیے بروکلمان کی نسبت سیزگین صاحب کی کتاب (تاریخ التراث العربی) زیادہ جامع اور کامل تر ہے۔

بروکلمان کی تاریخ ادبیات عربی پر سیزگین صاحب کی کتاب کی فوقیت کی چند اور وجوہات بھی ہیں، مثلاً وہ سب سے پہلے بروکلمان کی غلطیوں کی تصحیح کرتے ہیں۔ ان کی خامیاں دور کرتے ہیں، فروگذاشتوں کی تکمیل کرتے ہیں اور بہت سے اضافے کرتے ہیں۔ اس کے بعد زیر بحث قلمی مسودے کے اوراق یا صفحات کی تعداد اور سنہ کتابت بھی لکھ دیتے ہیں اور کتاب کے مبہم عنوان یا موضوع کی تشریح کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ زمانی ترتیب کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں، جس سے کتاب سے استفادہ آسان اور سہل ہو گیا ہے۔ وہ اپنے اضافات پر نشان لگا دیتے ہیں۔ افسوس ہے کہ مصنف کا دائرہ کار صرف چار سو تیس ہجری (۴۳۰ھ) تک کے ارباب علم اور ان کی تصانیف کے تذکرے تک محدود ہے کیونکہ فاضل مصنف کے خیال میں یہ زمانہ علوم عربیہ اسلامیہ کی نشاط کا سنہری دور تھا اور اس کے بعد اصحاب علم کی توجہ شرح، حاشیہ اور تلخیص پر مرکوز ہو گئی تھی۔

کتاب کی پہلی جلد علوم قرآن، حدیث، فقہ، عقائد اور تصوف کے مضامین اور ان پر لکھی جانے والی کتابوں کے بیان پر مشتمل ہے، اس کے مقدمہ میں مشرق و مغرب کے مختلف کتاب خانوں کی قلمی کتابوں کی تفصیلی فہرستوں کا ذکر ہے، اس کے بعد پھر عربی مصادر اور یورپی مآخذ مذکور ہیں۔

دوسری جلد تاریخ اور تیسری جلد میں زمانۂ جاہلیت، صدر اسلام، عہد

بنی امیہ اور عہد بنی عباس کے شعراء، ان کے دواوین اور ان کی شروح کی تفصیل ہے اور یہ جلد سب سے زیادہ ضخیم ہے۔ چوتھی جلد علم طب اور پانچویں علم کیمیا، علم نباتات اور زراعت اور ان کی کتابوں کے بارے میں ہے۔ چھٹی میں ریاضیات اور اس کی شاخوں کا ذکر ہے .... ساتویں میں احکام النجوم اور علوی آثار کے علوم اور متعلقہ کتب مذکور ہیں، آٹھویں میں علم لغت کا بیان ہے جبکہ نویں علم نحو اور اس پر تصانیف کے لیے مخصوص ہے۔ افسوس ہے کہ آخری پانچ جلدیں ابھی دستیاب نہ ہو سکیں۔ ان ضخیم مجلدات کے سرسری مطالعہ سے فاضل مصنف کی وسعت معلومات، وسعت نظر اور علوم عربیہ اسلامیہ سے عشق کی حد تک لگاؤ کا کسی قدر اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

کتاب کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر الہیئۃ المصریۃ العامہ للتالیف والنشر، قاہرہ نے اصل جرمن کتاب کی پہلی جلد (علوم قرآن اور حدیث) کا عربی ترجمہ ۱۹۷۱ء میں تاریخ التراث العربی کے نام سے شایع کیا تھا۔ اس کے بعد نامعلوم وجوہ کی بنا پر یہ کام التوا میں پڑ گیا۔ اب پچھلے چند برسوں میں ریاض کی جامعہ امام محمد بن سعود نے تمام جلدوں کے کامل ترجمے کا ذمہ لیا ہے۔ ان میں سے ابھی ترجمہ کی دس جلدیں مل سکی ہیں جو اصل کتاب کی تین جلدوں کے برابر ہیں۔

سیزگین صاحب کو علم حدیث سے بڑی دلچسپی ہے، چنانچہ انھوں نے حدیث کی کتابت اور اس کی تدوین اور تالیف پر بصیرت افروز بحث کی ہے جو اہل علم کے لائق مطالعہ ہے۔ انھوں نے صحیح لکھا ہے کہ علوم اسلامیہ کی نشو و نما اور ان کی ترقی اور پیشرفت سے گہری واقفیت کے لیے علم حدیث کا فہم نہایت ضروری ہے۔

انھوں نے حدیث کے بارے میں یوروپین فضلا مثلاً سپرنگر، گولڈ تسیہر (GOLD ZIHER) اور یوسف شاخت کے بعض غلط سلط نظریات کی بھی پرزور تردید کی ہے مصنف کے خیال میں ان کی فکری گمراہی اور کج فہمی کی بڑی وجہ اصول حدیث اور مصطلحات حدیث سے ان کی ناواقفیت ہے، اسی لیے یہ یوروپی فضلاء کتابتِ حدیث اور تدوین حدیث کے فرق کو اچھی طرح سمجھ نہ سکے اور تنگ نظری اور کم علمی سے سلاسل رواۃ کی صحت، ضرورت اور اہمیت کے منکر ہوگئے۔ ان کے بیان کے مطابق حدیث کی اولین مدون کتاب معمر بن راشد (م ۱۵۴ھ) کی الجامع ہے جسکی بیشتر روایات مصنف عبدالرزاق[له] میں شامل ہیں۔ ان کی تحقیق کے مطابق امام بخاریؒ، امام مسلمؒ اور امام احمد بن حنبلؒ وغیرہم نے اپنے پیشرو محدثین کے صحائف اور مجامیع، بالخصوص موطا امام مالکؒ کی مرویات کو اپنی جوامع اور مسانید میں شامل کر دیا ہے، بلکہ امام بخاریؒ نے ان کے علاوہ بہت سی لغوی، تاریخی اور فقہی کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔

مصنف کے طریقۂ کار اور کتاب کے مشمولات اور مندرجات سے واقفیت کے لیے یہاں ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے، وہ مشہور محدث ابن ابی شیبہ کا ان الفاظ میں تذکرہ لکھتے ہیں:

"ابو بکر عبداللہ بن محمد ابراہیم بن عثمان العبسی الکوفی المعروف بابن شیبہ ۱۵۹ھ/۷۷۵ء میں پیدا ہوئے، بغداد میں زندگی گزاری، اور عبداللہ بن المبارک

له مصنف عبدالرزاق آج سے بیس برس قبل مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی تصحیح و تحقیق سے بیروت سے شایع ہو چکا ہے۔

اور وکیع بن الجراح وغیرہم سے روایت کی اور خود ان سے بخاری، مسلم، ابوداؤد وغیرہ نے روایت کی ہے۔ وہ اپنے زمانے کے مشہور و معروف محدث تھے، انھوں نے ۲۳۵ھ/۸۴۹ء میں وفات پائی۔

حالات کے مآخذ (۱) ابن سعد: طبقات، ۷: ۲۸۸؛ (۲) ابن ابی حاتم: الجرح والتعدیل، ۲/۲/۱۶۰؛ (۳) ابن الندیم: الفہرست؛ (۴) قیسرانی: الرجال؛ (۵) خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، (۶) الذہبی: میزان الاعتدال: (۷) الذہبی: تذکرۃ الحفاظ، ۴۳۲-۴۳۳؛ (۸) ابن حجر: التہذیب، ۶/۲-۴؛ (۹) ابن العماد: شذرات الذہب، ۲/۸۵، (۱۰) ابن کثیر: البدایۃ والنہایۃ، ۱۰/۳۱۵، (۱۱) ابن تغری بردی: النجوم الزاہرہ، ۲/۲۸۲، (۱۲) الزرکلی: الاعلام ۴/۲۶۰، (۱۳) کحالہ: معجم المؤلفین، ۶/۱۰۷، (۱۴) بروکلمان: تکملہ ۱/۲۱۵۔

آثار علمیہ (۱) المصنف فاضل مصنف نے تقریباً پندرہ کتاب خانوں کا حوالہ دیا ہے جن میں مصنف کی مختلف جلدیں موجود ہیں۔ ان کتاب خانوں کی فہارس کی مدد سے ہر جلد کے صفحات کی تعداد اور سنہ کتابت بھی مذکور ہے۔

(۲) کتاب الرد علی ابی حنیفہ (اردو ترجمہ جو ملتان سے شایع ہونے والے چند اجزا سے ماخوذ ہے) دہلی ۱۳۳۳ھ۔

محمد زاہد کوثری: النکت الطریفہ فی التحدث عن ردود ابن ابی شیبہ، قاہرہ ۱۳۶۵ھ؛ (۳) التاریخ، (۴) کتاب الادب، (۵) کتاب الایمان، ان ہر سہ کتابوں کے چند اوراق کتاب خانہ الظاہریہ دمشق میں موجود ہیں۔"

(تاریخ التراث العربی، جلد اول، صفحہ ۲۰۵ تا ۲۰۷)

جامع الصحیح البخاری کے ضمن میں سیزگین صاحب نے صحیح بخاری کی چھپن (۵۶) مطبوعہ و غیر مطبوعہ شروح کا ذکر کیا ہے۔ ان میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے صاحبزادے نورالحق کی فارسی شرح بعنوان تیسیر القاری فی شرح صحیح البخاری (۵ جلدیں، مطبوعہ لکھنؤ ۱۳۰۵ھ) بھی شامل ہے۔ وہ مولوی وحید الزماں کی کتب حدیث کے اردو تراجم کا بھی ذکر کرتے ہیں اور بعض پنجابی تراجم کی بھی نشاندہی کرتے ہیں، لیکن انہیں مولانا خلیل احمد سہارن پوری کی بذل المجہود فی حل ابی داؤد اور مولانا عبدالرحمان مبارک پوری کی تحفۃ الاحوذی (شرح ترمذی) کا علم نہیں ہے۔ تاریخ علم فقہ کے ذکر میں مصنف نے فقہ اور فقہائے مجتہدین کی تصانیف کا تفصیل سے تعارف کرایا ہے۔ انھوں نے دنیا کے مختلف کتاب خانوں میں امام محمدؒ کی الجامع الکبیر کی ستّرہ شرحوں کی نشاندہی کی ہے جن میں دو منظوم ہیں۔

تاریخ التراث العربی کی طباعت و اشاعت کی داستان بھی بڑی دلچسپ ہے۔ کتاب تکمیل کے بعد کئی برس تک اقوام متحدہ کے ذیلی ادارہ یونیسکو میں طباعت کے لیے پڑی رہی۔ ادارہ کے ارباب اہتمام حیرت میں تھے کہ فرد واحد نے کسی معاون و مددگار کے بغیر تن تنہا اتنا بڑا کام کیسے پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا۔ وہ مختلف حیلوں بہانوں سے کام کو ٹالتے رہے۔ بالآخر مطبع بریل، لائیڈن (ہالینڈ) کے منیجر نے تمام مخالفتوں اور اعتراضوں کی پروا نہ کرتے ہوئے کتاب کی تمام جلدوں کو اپنے پریس کی روایتی صحت و صفائی اور حسن و خوبی کے ساتھ شایع کر دیا، شاید آخری دو جلدیں ابھی تک شایع نہیں ہو سکیں۔

افسوس ہے کہ کتاب کے عربی ترجمے میں ہندوستانی علما اور ان کے

شہروں کے نام غلط چھپ گئے ہیں حالانکہ عربی ترجمہ پر نظر ثانی کرنے والوں میں شیخ عبدالفتاح ابوغدہ بھی شامل رہے ہیں، جو پاکستان اور بھارت اکثر آتے جاتے رہتے ہیں۔ اس کتاب میں مولوی محمد شفیع کو محمد شافعی، مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندی کو جابر احمد دیبندی، پٹنہ کو باتنا، دہلی کو دلہی اور کان پور کو کوانبور لکھ دیا گیا ہے، لیکن ان چند فروگذاشتوں کی وجہ سے کتاب کی قدر و قیمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

سیزگین صاحب نے تاریخ التراث العربی کی تصنیف کے علاوہ ابوعبید قاسم بن سلام کی فضائل القرآن اور الناسخ والمنسوخ فی القرآن (دو جلدیں) ابوبکر بن وحشیہ کی کتاب الفلاحۃ النبطیہ اور ابوزید بلخی کی مصالح الابدان والانفس اور دوسری طبی کتابوں کے اصل قلمی نسخے عکسی طباعت سے جامعۂ فرانکفرٹ[1] کی جانب سے شایع کیے ہیں۔ ان علمی خدمات کے اعتراف میں سعودی حکومت نے سیزگین صاحب کو شاہ فیصل انعام بھی عطا کیا ہے، لیکن انھوں نے اس انعام سے حاصل ہونے والی رقم کو جامعہ فرانکفرٹ کے شعبہ طب اسلامی کی نذر کر دیا ہے۔

آخر میں ہم فاضل مصنف کے علاوہ سعودی حکومت کے بھی شکر گذار ہیں، جس کی علم پروری کے طفیل یہ قیمتی علمی تحفہ علوم عربیہ اسلامیہ کے شائقین کو حاصل ہوا ہے۔

---

[1] FRANKFURT (مغربی جرمنی)

---:---

عبدالغفور نساخ

بابائے اردوئے بنگال

از

پروفیسر عبدالسبحان کلکتہ

جن مایۂ ناز شخصیتوں نے بنگال کی سرزمین میں اردو زبان و ادب کی ترویج اور توسیع کی کوششیں کی ہیں ان میں مولوی عبدالغفور نساخ (۱۸۳۴ - ۱۸۸۹) کا نام سرِ فہرست ہے۔ تاریخ ادب اردو کا کوئی بھی مورخ ان کی ادبی خدمات سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ نساخ نہ صرف ایک اونچے درجے کے شاعر تھے بلکہ ایک اچھے نقاد، ایک معتمد تذکرہ نگار اور ایک کامیاب مصنف بھی تھے۔ دلی، لکھنؤ اور رام پور جیسے اردو ادب کے مراکز سے دوری کی وجہ سے بنگال کے اردو شاعر اور ادیب کی طرف کسی کی نظر نہیں اٹھتی تھی اس پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ نساخ نے بنگالی ہونے کے باوجود پچپن سال کے قلیل عرصۂ حیات میں تصنیف و تالیف کا جو گرانقدر سرمایہ یادگار چھوڑا ہے وہ معیار اور مقدار کسی اعتبار سے بھی معاصر شعرا اور ادیبوں کے سرمایے سے کم نہ تھا دراصل ان کی شخصیت جامع الکمالات اور کثیر الجہات تھی۔

نساخ کے مختصر حالات نساخ خان بہادر نواب عبداللطیف کے چھوٹے بھائی اور ۳۱ جنوری ۱۸۳۴ء مطابق روز عید الفطر ۱۲۴۹ھ کو کلکتہ کے محلہ کلنگہ میں پیدا ہوئے[۱]۔ سات سال کی عمر میں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں داخل ہوئے لیکن والد کے انتقال

کے سبب تعلیم چھوڑنی پڑی۔ تلاش معاش میں ڈھاکہ پہنچے۔ پہلے سشن جج کے دفتر میں ملازم ہوئے پھر صدر دیوانی عدالت میں مترجم مقرر ہوئے۔ عربی۔ فارسی اور اردو میں پوری مہارت کے ساتھ انگریزی میں بھی ان کو دسترس حاصل تھی بنگلہ اور ہندی بھی لکھ پڑھ لیتے تھے۔ ۱۸۶۰ء میں ڈپٹی مجسٹریٹ اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے اس زمانے میں تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے لیے انگریزی سرکار میں ملازمت کا یہ سب سے اعلیٰ عہدہ سمجھا جاتا تھا۔ ملازمت کے سلسلے میں ان کا تقرر بریسال، راجشاہی، بھاگل پور، ڈھاکہ، سلہٹ، بیربھوم، ہوگلی اور میدنی پور میں ہوا۔ چار بار دلی کا سفر کیا۔ لکھنؤ اور دوسرے شہروں میں بھی گئے۔ یکم فروری ۱۸۸۹ء کو پچپن سال کی عمر میں سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور پنشن حاصل کی۔ لیکن زندگی نے وفا نہیں کی اور اسی سال ۴ جون کو داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ کلکتہ کے پارک سرکس میدان کے قریب تال بگان قبرستان کے ایک کونے میں مدفون ہوئے۔ ان کی قبر چند سال پہلے تک پہچانی جا سکتی تھی لیکن اب اس کی شناخت بھی مشکل ہے۔ یہ سطور نساخ کی صد سالہ برسی کی مناسبت سے تحریر کی جا رہی ہیں[۲]۔

شاعری کا طرز و اسلوب شاعری میں نساخ کی موزونیت طبع فطری تھی۔ رشید النبی وحشتؔ اور اکرام احمد ضیغمؔ جیسے کامل الفن کے شاگرد تھے۔ بہت کم مدت میں وہ فن سخنوری میں عبور حاصل کر چکے تھے اور شہرت اس قدر جلد ملی کہ بیشتر شعرا ان سے شرف تلمذ حاصل کرنے کے متمنی ہوئے۔ اس طرح نساخ بہت کم عمری میں ملک گیر شہرت اور عظمت کے مالک بن گئے اور اپنا ایک الگ اسکول قائم کر لیا جس کے تلامذہ میں ان کے فرزند ابوالقاسم شمسؔ، عصمت اللہ نسخؔ اور رضا علی وحشتؔ جیسے

کہنہ مشق شاعر علی الترتیب شامل تھے[3]۔

نساخ شاعری میں کبھی طرز لکھنو کی پیروی کرتے تھے اور کبھی رنگ دہلی کی۔ دونوں دبستان شاعری کے بین نقوش ان کے کلام میں ملتے ہیں لیکن انکا خاص میلان لکھنوی طرز کی جانب تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے جب شعر گوئی کا آغاز کیا تو سرزمین بنگال میں اسی طرز کا بول بالا تھا۔ اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کے ساتھ بہت سے نامور لکھنوی شعرا کلکتہ چلے آئے تھے اور مٹیا برج میں جو چھوٹا لکھنؤ کہلاتا تھا۔ بڑے بڑے مشاعرے ہوتے تھے انتزاع سلطنت اودھ کے بعد شعر و شاعری کی محفل جو یہاں جمی اس میں سکہ رائج الوقت رنگ لکھنو یا رنگ ناسخ تھا اس لیے نساخ کی شاعری میں زیادہ تر آورد و تصنع، شوکت الفاظ، مبالغہ اور بیجا تخیل آرائی نمایاں ہے ان کے فن میں دماغ سوزی زیادہ اور دل سوزی اور جگر کاوی کم ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ جہاں انھوں نے لکھنوی طرز کی پیروی کو روا رکھا وہاں دہلوی انداز بیان کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ کسی ایک دبستان کی تقلید کو لازمی نہیں سمجھتے تھے۔ بقول امین ہاشمی[4]:-

"نساخ نے غالب کی نکتہ طرازی اور بلند پروازی اور جرأت کی معاملہ بندی اور دل پذیری کے بین بین ایک اسلوب اختیار کیا ..... یوں کہنا چاہیے کہ نساخ نے معاملہ بندی کو جرأت کی سطح سے ذرا بلند کر کے غالب کے مقام پر پہونچانا چاہا ہے"۔

یہی اسلوب ان کی شاعرانہ عظمت کی امتیازی شان ہے۔ یہ مسلم ہے کہ نساخ ایک قادر الکلام اور نکتہ رس شاعر تھے۔ جنھوں نے ایسے علاقے میں شاعری کی شمع

روشن کی جو دلی اور لکھنؤ سے دور تھا اور جہاں کی مادری زبان اردو نہ تھی۔ نساخ سے جو چار دیوان یادگار ہیں۔ دفتر بے مثال، اشعار نساخ، ارمغان اور ارمغانی۔ پہلے دو میں لکھنؤ کی شاعری کا رنگ غالب ہے لیکن آخری دو مجموعے میں دہلی کی دبستان شاعری کا اثر حاوی ہے۔ حسرت موہانی نے ناسخ کے دیوان کے بارے میں کہا ہے کہ یہ گلدستہ ضرور ہے لیکن کاغذی پھولوں کا[5]۔ اگرچہ یہ قول نساخ کے بیشتر اشعار کے لیے بھی صادق آتا ہے تاہم شاعر کے استادانہ اسلوب میں کلام نہیں۔ بقول رضا علی وحشت

"جب تک ناسخ اور آتش، امیر و وزیر، بحر و صبا استاد تسلیم کیے جائیں گے نساخ کی استادی بھی مسلم رہے گی"۔

نساخ کو متعدد اصناف سخن میں مہارت تھی۔ صنایع و بدایع کی طرف ان کی طبیعت کس درجہ مائل تھی اس کا اندازہ ان کے ایک مطلع سے ہوتا ہے جو بقول نواب صدیق حسن خان بتیس مختلف طریقوں سے پڑھا جا سکتا ہے[6]۔ وہ مطلع یہ ہے۔

بازوے او شاخ سمن مژگان او تیغ قضا   گیسوے او مشک ختن مژگان او تیر جفا

مشہور ہم عصر شاعر فخر بنگالہ سید محمود آزاد نے نساخ کے بارے میں کہا ہے[7]:

ہوا ہے خامہ رنگین نوا غزل پرداز   ادائے خاص ہے عبدالغفور خاں کے لیے

وہ قدردان سخن شاعر بلند خیال   ہے جس کی داد سند سارے نکتہ داں کیلئے

نساخ کی شاعرانہ زندگی کا ایک ناقابل فراموش باب ان کے ادبی معرکے بھی ہیں جنکو ان کی تصنیف "انتخاب نقص" نے جنم دیا تھا۔ اس کتابچہ میں اپنی ناقدانہ جرأت کا اظہار کرتے ہوئے نساخ نے اس زمانے کے ممتاز ترین شعرا انیس اور دبیر کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے ان کے مرثیوں میں زبان و بیان، روزمرہ و محاورہ اور تذکیر و تانیث کی

سینکڑوں غلطیاں نکالیں اس پر اہل لکھنؤ بہت برہم ہوئے اور نوبت جواب در جواب کی آئی۔ گو نساخ کے اعتراضات ہر لحاظ سے درست نہیں تھے تاہم اس کے بعض مثبت نتائج بھی نکلے اور ادب پر کسی خاص گروہ اور طبقہ کی اجارہ داری کے خاتمہ کی راہ ہموار ہو گئی۔

تذکرہ نگاری

نساخ کی تذکرہ نگاری کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے تین تذکرے لکھے ہیں "قطعۂ منتخب"، "سخن شعرا" اور "تذکرہ معاصرین" ان میں سے ہر ایک کو یک گونہ انفرادیت حاصل ہے۔ اول الذکر پہلا تذکرہ ہے جس میں قطعہ نگار شعرا کے تراجم اور ان کے منتخب قطعات ردیف وار یکجا کیے گئے ہیں۔ اردو تذکرہ نگاری کی پوری تاریخ میں یہ کتاب منفرد نوعیت کی ہے۔ دوسرا تذکرہ "سخن شعرا" نساخ کی ایک معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔ اس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہ سب سے ضخیم تذکرہ ہے جس میں تقریباً پونے تین ہزار شعراء کا ذکر آیا ہے اس کی بدولت صوبہ بنگال اور بہار کے دور دراز علاقوں کے بعض ایسے شعراء کے حالات اور اشعار محفوظ ہو گئے ہیں جو کسی اور تذکرے میں نظر نہیں آتے۔ اس کے علاوہ نساخ نے اپنے شاگرد اور اپنے معاصرین کے شاگردوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ آج اگر "سخن شعرا" موجود نہیں ہوتا تو ہم کو نہ بنگال کے ان شعراء کے متعلق کوئی علم ہوتا اور نہ اس کا پتہ چلتا کہ دلی اور لکھنؤ سے اس قدر دور رہنے کے باوجود بنگال اور بہار کے ہر خطے میں اردو شعراء اور اد باداد سخن دے رہے تھے کیونکہ عام طور پر اردو ادب کے مورخوں نے اس مردم خیز خطہ کو زیادہ قابل اعتنا نہیں سمجھا ہے کلکتہ، فرید پور، ڈھاکہ، چاٹگام، سلہٹ اور میمن سنگھ وغیرہ کے تقریباً پچاس شعراء سے ہماری واقفیت محض اسی "سخن شعراء" کی بدولت ہے۔ اس کتاب سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ

سرزمین بنگالہ بھی اردو کے خدمت گذاروں اور اہل کمال سے معمور رہ چکی ہے۔ علامہ وحشت کلکتوی اس تذکرے کی اہمیت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"راقم السطور کے خیال میں یہ تذکرہ بلحاظ جامعیت کل اردو تذکروں پر سبقت لے گیا ہے ...... کلام کا انتخاب نہایت عمدہ اور رائے بے باکانہ ظاہر کی گئی ہے"[۵۴] غرض تنہا تذکرہ "سخن شعراء" نساخ کو اردو ادب میں شہرت دوام بخشنے کے لیے کافی ہے۔

نساخ کا تیسرا اہم تذکرہ موسوم بہ "تذکرۂ معاصرین" مصنف کی زندگی ہی میں چھپ گیا تھا لیکن یہ ناقص رہ گیا اور ان کے معاصر فارسی گو شعرا کا یہ ردیف وار تذکرہ حرف "ع" تک ہی چھپنے پایا تھا کہ انکا انتقال ہو گیا۔ اس نایاب تذکرہ کا واحد نسخہ ڈھاکہ یونیورسٹی (بنگلہ دیش) کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ "سخن شعراء" کی طرح یہ تذکرہ بھی نساخ کا شاہکار ہے جو اپنی جدت وندرت کے لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے،[۵۵] اس کتاب میں زیادہ تر بنگال سے تعلق رکھنے والے فارسی گو شعرا کو جگہ دی گئی ہے، ایسے شعراء کی تعداد کم از کم چھپن ہے۔[۵۶] ان سخنوروں میں اکثر کا سراغ اس تذکرہ کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتا۔

نساخ کے تذکروں کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دور کے تنقیدی شعور سے بخوبی واقف تھے۔ اور شعر کی خوبی یا برائی، صنایع وبدایع، عروض وقوافی سے اچھی طرح آشنا تھے۔ بالخصوص رسالہ "انتخاب نقص" فن تنقید نگاری کی تاریخ میں ایک مفید اور بیش قیمت اضافہ ہے۔ مذکورہ تصانیف کے علاوہ نساخ نے نظم ونثر کی مزید سولہ کتابیں ترتیب دی ہیں، جن میں ان کی خود نوشت سوانحعمری

آخری غیر مطبوعہ تصنیف تھی جس کو سنہ ۱۹۸۶ء میں راقم الحروف نے ترتیب دے کر ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی طرف سے شایع کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نساخ ایک مسلم الثبوت استاد، قادر الکلام شاعر، تذکرہ نویس، تاریخ گو اور کثیر التصانیف ادیب تھے۔ انھوں نے اردو کی گراں قدر خدمت کی ہے اور مشرقی ہندوستان میں اردو زبان و ادب کو فروغ دینے میں جو نمایاں حصہ لیا ہے اس کی بنا پر انھیں بابائے اردوئے بنگالہ کہنا بیجا نہ ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے استاد ضیغمؔ اور وحشتؔ جیسے کہنہ مشق شاعر یکتائے روزگار تھے لیکن مجموعی طور پر نساخ اپنے استادوں سے بھی گوئے سبقت لے گئے ہیں۔ ان دونوں استادوں کے کلام کے نمونے بھی نساخ کے تذکروں سے ہی ملتے ہیں۔ اسی طرح مرزا جان طپشؔ جو فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے نساخ سے بہت پہلے گزرے ہیں اور ان کا کلام بھی ان سے پہلے شایع ہوا تھا۔ ان کے معاصرین میں عبید اللہ العبیدی، حکیم اشرف علی مست، خواجہ فیض اللہ شائقؔ، عبدالرحیم صباؔ، محمود آزادؔ جیسے مشاہیر روزگار تھے لیکن نساخ کی حیثیت متقدمین اور معاصرین میں بالکل منفرد نظر آتی ہے۔ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن اور بنگال کے شعراء اور ادیبوں کے میر کارواں تھے۔ دلی کے اجڑنے اور سلطنت اودھ کے انقراض کے بعد اردو ادب کا مرکز کلکتہ منتقل ہو گیا تھا جس کے مرکزی کردار خود نساخ تھے۔ نساخ کی انفرادیت کا سب سے تابناک پہلو یہ تھا کہ انھوں نے لکھنؤ اور دلی دبستانوں میں یگانگت اور اتحاد پیدا کرنے کی ایک نئی راہ نکالی اور اردو شاعری کو اسکا موقع عطا کیا کہ وہ ان دونوں خرمنوں کی خوشہ چینی کرے اور ان سے فیضیاب ہو۔ انھوں نے اس پر خود عمل پیرا ہو کر ایک مثال بھی قایم کر دی۔ اس لحاظ سے نساخ کو

اس دبستان فکر و خیال کا بانی یا امام کہا جا سکتا ہے۔ یہ کام ان سے پہلے کسی شاعر و ادیب نے انجام نہیں دیا۔ بنگال جیسی دور افتادہ جگہ میں اردو شاعری کی شمع کو فروزاں کرکے اور اردو ادب کے دامن کو اپنی گوناگوں قلمی خدمات سے مالامال کرکے انھوں نے اردو ادب پر ایک احسان کیا ہے۔ اسی لیے وہ بابائے اردوئے بنگال کہلانے کے مستحق ہیں۔

حوالے

[1] "خود نوشت سوانح حیات نساخ" کے انگریزی دیباچے میں راقم الحروف نے پہلی شوال سنہ ۱۲۴۹ھ کو ۳۱ جنوری سنہ ۱۸۳۴ء قرار دیا ہے۔ مگر جناب مالک رام صاحب نے "خود نوشت" پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے غلط بتایا ہے (آجکل، نئی دلی، مئی ۱۹۸۰)۔ انکے خیال میں مذکورہ عربی تاریخ کا تطابق ۳۱ جنوری کے بجائے ۱۱ یا ۱۲ جنوری ہے۔ تبصرہ نگار کا حساب صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ اس بات کی سند موجود ہے کہ نساخ ۳۱ جنوری سنہ ۱۸۸۹ء کو اپنی عمر کا ۵۵ سال پورا کرکے اسی دن اس زمانے کے قاعدہ کے رو سے سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور پنشن حاصل کی۔ (انگریزی اخبار اسٹیٹسمین، کلکتہ، مورخہ ۱۶ جون ۱۸۸۹ء) [2] نساخ کی زندگی کے تفصیلی حالات ان کی "خود نوشت سوانح حیات" مرتبہ راقم الحروف، مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ ۱۹۸۶ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ [3] ان میلوں شعراء کے حالات و کمالات کے لیے ملاحظہ ہو: ......، سید لطیف الرحمٰن، "نساخ سے وحشت تک" کلکتہ ۱۹۵۹ [4] صحیفہ، لاہور، جون۔ اگست ۱۹۵۹ [5] اردوئے معلیٰ اکتوبر۔ نومبر ۱۹۰۷ [6] ایضاً بحوالہ تذکرہ شمع انجمن مولفہ نواب صدیق حسن خان [7] دیوان آزاد، کلکتہ، سنہ ۱۳۰۷ھ ص ۱۱۳ [8] ماہ نو، کراچی، مارچ ۱۹۵۱ [9] صدر الحق، نساخ: حیات و تصانیف، کراچی سنہ ۱۹۶۹ء ص ۲۳۷ - ۲۴۵ -

ادبیات

غزل

از جناب وارث ریاضی، مغربی چمپارن، بہار

مدعا دل کا کبھی لب پر مرے آیا نہیں
کوئی رسوائے جہاں ہو جائے یہ اچھا نہیں

اب کے گلشن میں بہ انداز دگر آئی بہار
گل نہیں، سبزہ نہیں، خوشبو نہیں، نغمہ نہیں

میں اسیرِ غم رہا یا محو عیش و انبساط
کون سی تھی وہ گھڑی جس میں تجھے چاہا نہیں

تو ازل ہی سے رگ جاں سے بھی ہے نزدیک تر
پھر بھی اے ہمدم تجھے کیوں ہم نے پہچانا نہیں

سوزِ دل، زخم جگر، درد محبت کے سوا
اور قسام ازل سے میں نے کچھ چاہا نہیں

وعدۂ فردا پہ آیا حشر کے دن کا خیال
حشر کا دن بھی تو ان کا وعدۂ فردا نہیں

منزل مقصود تک پہنچوں یہ مقدوری کہاں
بے خودی شوق میں آگے بڑھا جاتا نہیں

جور ہی سے جور کے خوگر کو ملتا ہے سکوں
اب ترا لطف و کرم اے مہرباں اچھا نہیں

علم وہ گنج گراں مایہ ہے جس کے واسطے
رہزنوں کا ڈر نہیں، چوروں کا بھی خطرہ نہیں

کون ہے مجھ سا جہانِ عشق میں ناکامیاب
عمر بھر بخت رسا میرا کبھی جاگا نہیں

شاعری کو جس نے جانا شغلِ ارباب نشاط
اس نے وارث دردِ دل کا رمز ہی سمجھا نہیں

مطبوعات جدیدہ

تدوین سیر و مغازی مرتبہ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۲۰، مجلد، قیمت ۴۵ روپیے، پتہ شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند۔

اس کتاب میں سیر و مغازی کی تدوین کو موضوع بنا کر تیسری صدی ہجری تک کے مصنفین سیر و مغازی اور ان کی کتب و مولفات کا تذکرہ کیا گیا ہے، یہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں یہ دکھایا ہے کہ اس فن کی باقاعدہ تدوین سے قبل بھی بارگاہ نبوی میں عربوں کے ایام و وقائع کا چرچا رہتا تھا اور جب آپؐ کے دور میں غزوات و سرایا کا سلسلہ شروع ہوا تو ان کے ذکر سے آپؐ اور آپؐ کے جاں نثاروں کی محفلیں خالی نہیں رہتی تھیں، مصنف نے سیر و مغازی کا لغوی و اصطلاحی مفہوم بتانے کے بعد حدیث و روایت سے اس کا فرق واضح کیا ہے اور مغازی کی روایتوں کی کم پائیگی کا ذکر کیا ہے اور غزوات و سرایا کے نام اور ان میں شریک لوگوں کی تعداد اور غزوات کے ماہ و سن کی صراحت بھی کی ہے، دوسرے باب میں سیر و مغازی کے تحریری سرمایے کا ذکر ہے، اس میں قرآن کریم کے علاوہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافت راشدہ کے دور کی یادگار تحریروں، آپؐ کے مکاتیب اور بعض صحابہ و تابعین کی تحریروں کا تذکرہ کیا ہے، تیسرے باب میں تدوین سیر و مغازی کے

پہلے اور دوسرے دور کے مصنفین اور ان کی تصنیفات پر بحث و گفتگو کی ہے، اس میں بتایا ہے کہ سیر و مغازی کی ابتدا پہلی صدی کے نصف آخر میں مدینہ سے ہوئی جو اس کا مرکز تھا اور دوسرا دور دوسری صدی کی ابتدا سے شروع ہوا، چوتھے باب میں مختلف بلاد و امصار کے علمائے سیر و مغازی کے کمالات اور ان کی کتب زیر بحث آئی ہیں اور آخری باب میں سیر کی فقہی تدوین کا جائزہ لیا ہے، اس میں کتاب الجہاد والسیر کے عنوان سے فقہاء و محدثین کی کتابوں میں جو بحث کی گئی ہے اسکا اور اس فن میں لکھی جانے والی مستقل کتابوں اور ان کے مصنفین کا تذکرہ ہے۔ کتاب کی خوبی کے لیے مصنف کا نام ہی کافی ضمانت ہے، لیکن ان کے بعض خیالات بحث و نظر کا موضوع ہو سکتے ہیں انھوں نے خود بھی مغازی کی روایات کو احادیث سے کمتر بتایا ہے، اس کے باوجود ان کی صحت و وثوق پر اصرار کرنا اور احادیث ہی کی طرح انکی حجیت و استناد پر زور دینا بے معنی ہے، جن مصنفین مغازی کی دروغ گوئی شہرت عام کو پہنچی ہوئی ہے ان کی توثیق سے دین و مذہب کا تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا البتہ معترضین کو اس سے مواد ضرور مل جائے گا، امام احمدؒ کے قول (ص ۲۱) سے کتب مغازی کی جو بے اعتباری ثابت ہوتی ہے اسے محض خطیب کی ایک توجیہ ختم نہیں کر سکتی، ص ۲۴ کے عنوان "سیر و مغازی کے بیان میں شدت احتیاط اور دینی جذبہ" کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے دینی جذبہ کا پتہ تو چلتا ہے مگر شدتِ احتیاط کا کوئی ثبوت فراہم نہیں ہوتا، اسی صفحہ پر علامہ شبلیؒ پر جو اعتراض کیا گیا ہے وہ بیجا ہے، دراصل مصنف نے درجہ کے لفظ پر غور نہیں کیا، علامہ شبلیؒ کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ روایات کے عام انواع میں مغازی کا درجہ سب سے متاخر اور کم ہے نیز صحابہؓ و تابعین احکام

و مسائل کی روایتوں کی جانب جس قدر اعتنا کرتے تھے، اس قدر مغازی کی جانب نہیں کرتے تھے اور یہ دونوں باتیں خود مصنف کو بھی تسلیم ہیں، علامہ شبلیؒ کو روایات کے پرجوش حامی اس لیے مطعون کرتے ہیں کہ وہ ان میں نقد و نظر اور چھان بین کی ضرورت کے قائل تھے مگر روایتوں کی حمایت کے دعویدار ایک طبقہ کا حال یہ ہے کہ وہ بے جھجھک محدثین کو اپنے طعن و تشنیع کا نشانہ بناتا ہے، قاضی صاحب امام مالکؒ جیسے محدث و فقیہ کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں "امام مالکؒ نے ان کو مکاتب اور مدبر کے مسئلہ میں الجھا کر غلبہ حاصل کیا" (ص ۳۶) ابو عصمہ نوح بن ابی مریم کو اکثر بلکہ بالاتفاق تمام محدثین نے ضعیف، متروک اور ساقط الحدیث کہا ہے جس کا اعتراف بعض علمائے احناف کو بھی ہے مگر مصنف فرماتے ہیں کہ "ان کے متروک ہونے کی دوسری وجوہ ہیں..... جن میں ان کا حنفی ہونا اول نمبر پر ہے" (ص ۲۷۵) "یارو" کا لفظ کسی سنجیدہ اور علمی تحریر میں آنا ہی معیوب ہے، چہ جائیکہ محدثین اور ائمہ جرح و تعدیل کو اس سے موسوم کیا جائے۔

تفہیم غالب مرتبہ جناب شمس الرحمان فاروقی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۳۰۸، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۹۰ روپیے پتہ غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲-

غالب و متعلقات غالب پر تحقیق و تنقید اور کتابوں کی اشاعت کے لیے غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کا قیام عمل میں آیا ہے، اس نے دیوان غالب کی نئی شرح کی اشاعت کا جب منصوبہ بنایا تو اس کے لیے بجا طور پر اس کی نظر انتخاب اردو کے مشہور محقق و نقاد جناب شمس الرحمان فاروقی پر پڑی جن کے غور و فکر اور مطالعہ

وتحقیق کا ایک خاص موضوع غالب بھی ہے اور وہ غالب صدی سے پہلے ہی اشعارِ
غالب کی شرح وتحقیق کا مفید سلسلہ "شب خون" میں شروع کرکے اہلِ نظر سے
خراجِ تحسین حاصل کرچکے تھے، انھوں نے انسٹی ٹیوٹ کی درخواست پر "شب خون"
میں شایع شدہ مسودہ پر نظرِ ثانی اور مناسب ردوبدل کے بعد یہ کتاب مرتب کی ہے
جو غالب کے ۱۳۸ اشعار کی شرح وتوضیح پر مشتمل ہے، شارح نے اُن ہی اشعار کو موضوعِ
بحث بنایا ہے جن کے بعض گوشے اور پہلو ان کے خیال میں ابھی تک محتاجِ بحث و
تحقیق تھے یا جن کی شرح وتوضیح کا پورا حق ادا نہیں ہوا تھا، شرح میں لفظی
ومعنوی دونوں طرح کی خوبیاں زیرِ بحث آئی ہیں، جن سے مصنف کی جودتِ طبع،
نکتہ آفرینی، دقیقہ سنجی اور خوش ذوقی کے گوناگوں پہلو سامنے آتے ہیں، انھوں نے
جہاں غالب کے کلام کے محاسن بیان کرنے میں کوتاہی نہیں کی ہے وہاں اس کے بعض
کمزور پہلوؤں کی بھی نشاندہی کی ہے، جن اشعار میں مختلف قرأتوں کا احتمال ہے اس کا
اور مختلف نسخوں کے فرق واختلاف کا ذکر کرکے مرجح کی تعیین کی ہے، غالب کے یہاں ضلع جگت،
ترصیع اور لفظوں کے صوتی نظام کی جو دلکشی و دلآویزی ہے انکو بھی بیان کیا ہے، مصنف کو
مشرقی ومغربی ادبیات پر دسترس ہے اور غالب کی متعدد متداول شرحیں بھی انکے پیشِ نظر
رہی ہیں، ان سب سے اخذ وترک میں بڑے سلیقہ سے کام لیا گیا ہے یہ شرح تلاش وتفحص اور
غالبیات کے وسیع وعمیق مطالعہ کا نتیجہ ہے جو ادب وانشا کی لطافت وحلاوت، تحریر کی شگفتگی
ورعنائی اور مضامین وخیالات کی جدت وندرت کے علاوہ اعتدال وتوازن کا اچھا
نمونہ بھی ہے۔ حرج کا املا اب عموماً ہرج لکھا جاتا ہے اس کتاب
(ص۵) میں بھی یہی دیکھ کر تعجب ہوا۔

منتخب التذکرہ

تالیف جنمے جے، متر ارمان، ترتیب ڈاکٹر رئیس انور صاحب
تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۲۵۶ مجلد مع گردپوش،
قیمت: ۴۰ روپیے، پتہ عثمانیہ بک ڈپو، ۱۲۵ رابندرا سرانی کلکتہ ۷۰۰۰۷۳،

جنمے جے متر ارمان انیسویں صدی کے ایک صاحبِ کمال بنگالی کائستھ
تھے، وہ مشرقی تہذیب وتمدن اور علوم وادبیات کے دلدادہ اور سنسکرت اور
بنگلہ کے علاوہ فارسی، اردو اور برج بھاشا کے شیدائی تھے ان کا میلان اردو
شاعری کی طرف بھی تھا لیکن نثر سے انھوں نے زیادہ سروکار رکھا، سنسکرت،
بنگلہ اور برج بھاشا میں تصانیف یادگار چھوڑیں اور اردو شعرا کے دو تذکرے
منتخب التذکرہ اور نسخہ دلکشا بھی لکھے، اول الذکر کا ایک ہی قلمی نسخہ مولف کے
پرپوتے کے پاس تھا جو اب ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی ملکیت ہے، ڈاکٹر رئیس انور
ریڈر شعبۂ اردو ایل۔ این، متھلا یونیورسٹی دربھنگہ اس سے پہلے ارمان کی حیات
وخدمات پر ایک کتاب مرتب کرچکے ہیں، اب انھوں نے ایشیاٹک سوسائٹی
کے نسخہ کو بنیاد بناکر منتخب التذکرہ کا متن مع حواشی شایع کیا ہے، ارمان کے
اس تذکرہ میں قدیم دور سے لے کر ان کے عہد تک کے تقریباً ساڑھے تین سو شعرا
کا مختصر حال، اور ان کے پسندیدہ اشعار درج ہیں، شعرا کا ذکر حروفِ تہجی کی ترتیب
کے مطابق کیا گیا ہے، ایک کمیاب اور عدیم الحصول تذکرہ کی اشاعت ایک مفید
علمی وادبی خدمت ہے، شروع میں مرتب کے قلم سے مقدمہ میں ارمان کے حالات
وکمالات اور اس تذکرہ کے بارے میں ضروری معلومات کا ذکر بھی آگیا ہے،
حواشی میں ان کتابوں کے نام دیئے ہیں جن سے متن کی تصحیح میں مدد لی گئی ہے،

اس سے لائق مرتب کی محنت و جستجو کا پتہ چلتا ہے، مراجعت میں سہولت کے خیال سے شعرا کے ناموں کی فہرست بھی دی گئی ہے۔ ص۹ پر تشہیر کے بجائے شہرت اور ص۱۸ و ص۲۳ پر افتراق کی جگہ فرق لکھنا چاہیے تھا۔

فیض المنعم شرح اردو مقدمہ مسلم } از مولانا سعید احمد پالن پوری، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۷۶، قیمت تحریر نہیں، پتہ: مکتبہ حجاز، دیوبند۔

امام مسلم کبار محدثین میں تھے، ان کی صحیح کو غیر معمولی مقبولیت و شہرت نصیب ہوئی، علمائے فن اور محدثین نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا اور اس کی بکثرت شرحیں اور حواشی لکھے، اردو زبان میں بھی اس کتاب کے ترجمے کیے گئے اور شروح و حواشی لکھے گئے، صحیح مسلم کا مقدمہ خاص طور پر زیادہ اہمیت اور توجہ کا حامل ہے جس میں روایات واحادیث کے اصول و قوانین اور رواۃ و محدثین کے اوصاف و شرائط وغیرہ پر بے نظیر بحث کی گئی ہے، اس لیے اس کے ساتھ بھی پورا اعتنا کیا گیا اور اب اردو میں اس کے ترجموں اور شرحوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، جس کو دارالعلوم دیوبند کے ایک لائق استاذ حدیث مولانا سعید احمد صاحب نے محنت و دلچسپی سے مرتب کیا ہے، یہ شرح مدرسانہ نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے اس لیے اس میں عبارت کے ترجمہ و تحلیل کی جانب خاص توجہ کی گئی ہے اور غیر متعلق خارجی بحثوں سے کم تعرض کیا گیا ہے، شارح نے پہلے امام مسلم کے مدعا کا خلاصہ بیان کیا ہے، پھر اصل عبارت نقل کر کے اس کا ترجمہ دیا ہے اور آخر میں مختصر تشریح کی ہے اور الفاظ و لغات کے معنی تحریر

کیے ہیں اور ترکیبیں بھی دی ہیں، انھوں نے کہیں کہیں عام خیال سے اختلاف بھی کیا ہے جیسے معنعن حدیثوں پر بحث کرتے ہوئے امام مسلمؒ نے جن منتحلین حدیث کا ذکر کیا ہے ان سے شارح کے نزدیک امام بخاریؒ اور علی بن مدینی وغیرہ مراد نہیں ہیں، شروع میں انھوں نے امام مسلم کے مختصر حالات اور ان کی صحیح کی خصوصیات پر بھی گفتگو کی ہے، اس میں امام بخاریؒ سے اپنی صحیح میں امام مسلمؒ کے روایت نقل نہ کرنے کی جو وجہیں بتائی ہیں وہ عام لوگوں سے مختلف ہیں، اس زمانہ میں جب کہ عربی درسگاہوں میں معیار تعلیم روز بروز گرتا جا رہا ہے داخل درس کتابوں کے اردو ترجمے طلبہ کو مزید تن آسانی اور سہولت پسند بنا دیں گے۔

آداب اذان و اقامت مرتبہ مولانا مفتی محمد امین پالن پوری، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۶۰، قیمت ۵ اروپئے پتہ: گجرات بکڈپو محلہ قلعہ دیوبند، یو۔پی

اس کتاب میں اذان و اقامت کی اہمیت و فضیلت اور ان سے متعلق تمام ضروری احکام و مسائل، نیز موذن کے آداب و شرائط شرح و بسط کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں اور جو باتیں ممنوع و محذور ہیں یا جو بدعتیں اور غلط رسمیں اذان و اقامت میں داخل کر لی گئی ہیں، ان کی بھی نشاندہی کی ہے، غالباً اردو میں ابھی تک اس موضوع پر اتنی مفصل کتاب نہیں لکھی گئی ہے، مختلف فیہ امور و مسائل میں بجا طور پر مصنف نے اس مسلک کو مرجح قرار دیا ہے جو ان کے مسلک فقہ کے مطابق ہے ص۱۰۰ پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کے نزدیک امت کی وحدت و اجتماعیت کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے مگر ص۱۰۱ پر امت کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے والی یہ

دلخراش تحریر بھی لکھی ہے "غیر مقلد (اہل حدیث) مودودی (جماعت اسلامی) بدعتی اور
ایسے گمراہ لوگ جن کا اعتقاد حد کفر تک پہنچا ہوا نہیں ہے . . . . "

HOMMAGE a MAHOMET } از جناب جگن ناتھ آزاد مترجم ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب، ناشر Editions Tougi

30 rue Rene Boulanger 75101 PARIS

France.-

اردو کے مشہور محقق و نقاد اور مقبول ادیب و شاعر جناب جگن ناتھ آزاد
نے دسمبر سنہ ۵۹ء کے معارف میں "ولادت باسعادت۔ ساقی نامہ" کے عنوان سے
ایک نعتیہ نظم سپرد قلم کی تھی، اس کی اثر آفرینی اور دلکشی نے معارف کے قدیم کرمفرما
اور نامور فاضل و محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب پر وجد کی کیفیت طاری کر دی، اد
انھوں نے اس کا فرنچ ترجمہ کیا جو حال ہی میں شایع ہوا ہے، ڈاکٹر صاحب کی جہر تصدیق
نے پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی عالمگیر شہرت و مقبولیت میں چار چاند لگا دیا ع
یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے۔

سالانہ مجلہ سنہ ۱۹۸۹ء مرتبہ جناب کمال اختر لیین مبارکپوری صاحب تقطیع کلاں، کاغذ
کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۱۷۰، قیمت درج نہیں پتہ: انجمن طلبہ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اعظم گڈھ یوپی

طلبائے مدرسۃ الاصلاح سرائمیر نے سنہ ۱۹۸۹ء میں بھی اپنا سالانہ مجلہ بڑے اہتمام اور سلیقہ سے شایع کی
جس کیلئے وہ تحسین و آفریں کے مستحق ہیں چند کے سوا سب نگارشات طلبہ ہی کے قلم کی ہیں جنھوں نے مختلف النو
علمی دینی اور ادبی و سوانحی موضوعات پر اپنی استعداد کے مطابق مضامین لکھے ہیں جو انکی حیثیت کے لحاظ سے
اچھے ہیں آخر میں عربی و انگریزی مضامین کا حصہ ہے، ان سے بھی طلبہ کی محنت و سلیقہ کا پتہ چلتا ہے۔

"ض"